ستمبر ۲۰۲۶ء

پاک جمہوریت

وزارتِ اطلاعات و نشریات کا جریدہ

جلد: 66　شمارہ: 09

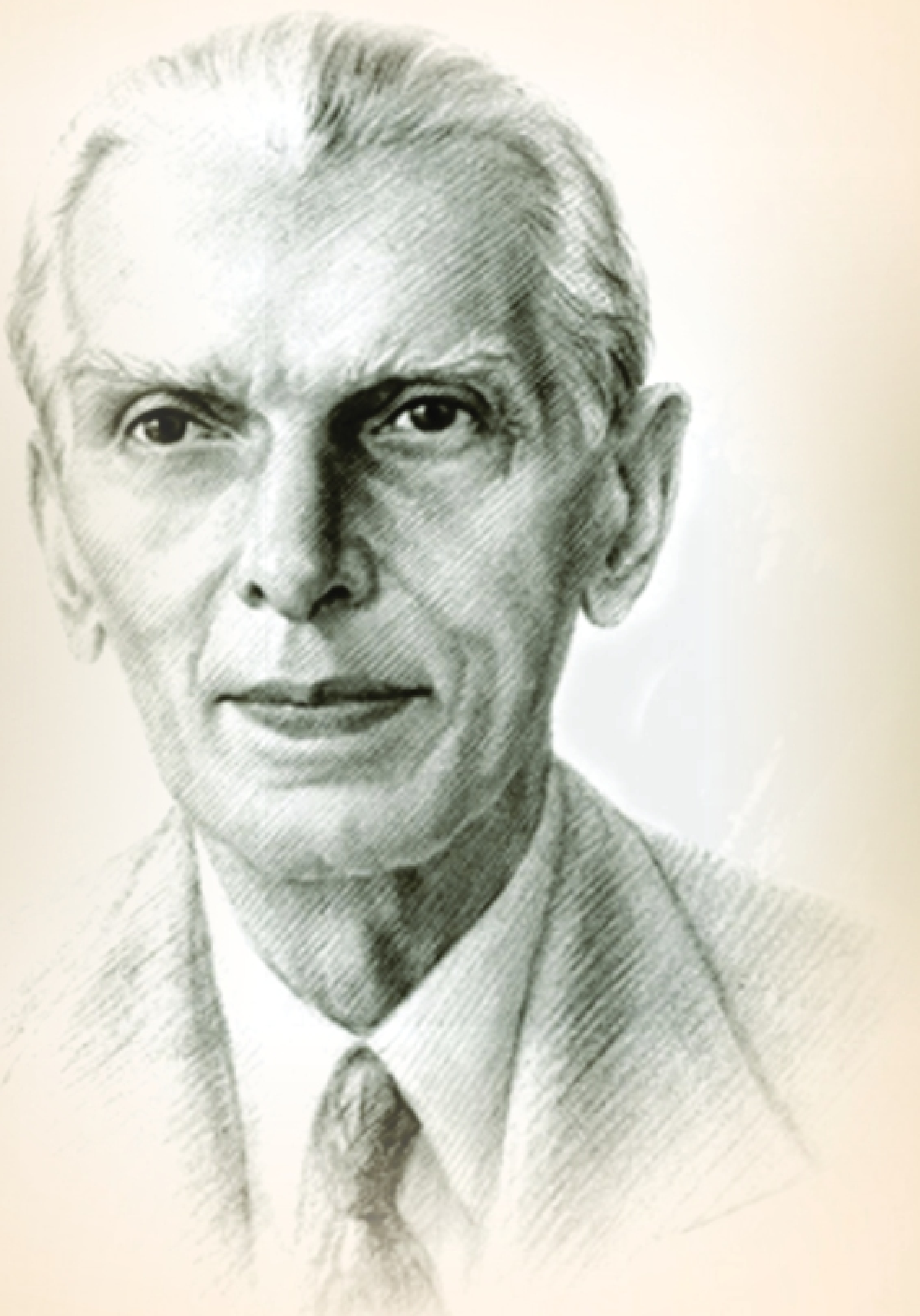

ستمبر ۲۰۲۶ء

DIRECTORATE OF ELECTRONIC MEDIA AND PUBLICATIONS

ستمبر ۲۰۲۶ء

پاک جمہوریت

وزارتِ اطلاعات و نشریات کا جریدہ

جلد:66 شمارہ:09

	اداریہ		۵
۱۔	جنگ ستمبر، بہادری شجاعت کی عظیم داستان	محمد زکریا	۶
۲۔	بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی 78ویں برسی پر	شفیق انور راجہ	۱۱
۳۔	پاکستان، ترکیہ اور سعودی عرب کا اتحاد مکہ جوائنٹ ڈیفنس ایگریمنٹ	اسماء بابر	۱۷
۴۔	آزاد جموں و کشمیر کے انتخابات	امتیاز احمد تارڑ	۲۳
۵۔	مکہ جوائنٹ ڈیفنس ایگریمنٹ	مائرہ جاوید	۲۸
۶۔	کیا نئے صوبوں کا قیام پاکستان کے مسائل کا حل ہے؟	ڈاکٹر محمد گلزار	۳۵
۷۔	امریکہ ایران جنگ اور آبنائے ہرمز کا تنازعہ	ناصر نقوی	۴۵
۸۔	پاکستان کے مختلف علاقوں میں سکیورٹی آپریشنز اور دہشت گردی	کنول افتخار	۵۱
۹۔	تجارتی دنیا میں پاکستان عالمی معیار کے لیے تیار	رباب زہرا	۵۶
۱۰۔	تعلیم بدلے پاکستان بدلے	فضیلہ اسلم	۶۲

نگران اعلیٰ: عمرانہ وزیر
نگران: محمد سلیم
مینجنگ ایڈیٹر: شعیبہ عباس

ایڈیٹر: مائرہ جاوید
ڈیزائنر: محمد وسیم

ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز،
291۔اے، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور
انتظامیہ: 042-99333909
مدیر: 042-99333912
email:editor@pakjamhuriat.org

انتباہ

ادارے اور میگزین ''پاک جمہوریت'' کا مقصد عوام الناس کو آگاہ کرنا اور بہترین مواد مہیّا کرنا ہے۔ البتہ شمارے میں شامل تمام مضامین مصنفین کی ذاتی آراء پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا ادارے یا ادارے کے کسی فرد پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

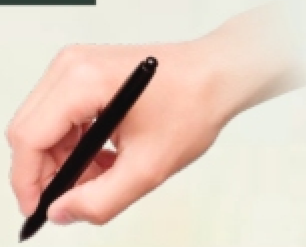

اداریہ

پاکستان ہمارا محبوب وطن ہے، جسے بے شمار قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا۔ 6 ستمبر ہمیں اپنی بہادر مسلح افواج کی لازوال قربانیوں کی یاد دلاتا ہے، جبکہ 11 ستمبر کو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی 78 ویں برسی عقیدت و احترام سے منائی جا رہی ہے۔ بابائے قوم کی جدوجہد اور قربانیاں ہمارے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہیں گی۔

ملک میں جاری سکیورٹی آپریشنز اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنے بہادر جوانوں کی کامیابی اور وطن میں امن کے لیے دعا گو ہیں۔ امید ہے پاکستان تجارت اور ای کامرس جیسے جدید معاشی شعبوں میں بھی تیزی سے ترقی کرے گا۔

آزاد کشمیر میں نئے وزیراعظم کے انتخاب کے بعد وہاں امن، استحکام اور سیاسی سکون کی امید ہے۔

نئے صوبوں اور انتظامی اکائیوں پر جاری بحث ملک کے انتظامی مسائل کو اجاگر کرتی ہے؛ اس معاملے پر فیصلہ قومی مفاد اور عوامی ضرورت کو سامنے رکھ کر ہونا چاہیے۔ پاکستان کی حقیقی تبدیلی کی سب سے بڑی امید نظامِ تعلیم میں بہتری سے وابستہ ہے، کیونکہ باشعور اور تعلیم یافتہ نسل ہی ملک کا مستقبل بدل سکتی ہے۔

مکہ مشترکہ دفاعی معاہدہ پاکستان کے لیے ایک اہم تزویراتی کامیابی ہے، جو باہمی اعتماد اور مؤثر دفاعی تعاون کی علامت ہے۔ دوسری جانب آبنائے ہرمز کی کشیدگی کے خاتمے کے لیے پاکستان کی سفارتی کوششیں خطے اور دنیا میں امن، استحکام اور خوشحالی کے فروغ میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

شکریہ

ایڈیٹر پاک جمہوریت

جنگ ستمبر، بہادری شجاعت کی عظیم داستان

محمد زکریا

(مصنف، کالم نگار ہیں اور پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں)

مشہور امریکی میگزین ''ٹائمز'' کے نمائندہ ''لوئیس کرار'' نے تیئس ستمبر 1965 کے شمارے میں جنگِ ستمبر کے محاذوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لکھا تھا کہ "میں پاک بھارت جنگ کو شاید بھول جاؤں مگر پاک فوج کا جو افسر مجھے محاذ پر لے گیا تھا، اس کی مسکراہٹ کو کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ یہ مسکراہٹ مجھے بتا رہی تھی کہ پاکستانی جوان کس قدر نڈر اور دلیر ہیں۔ جوان سے جرنیل تک کو میں نے اس طرح آگ کے ساتھ کھیلتے دیکھا ہے جس طرح گلی میں بچے کانچ کی گولیوں سے کھیلتے ہیں۔ جو قوم موت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا جانتی ہو، اسے بھلا کون شکست دے سکتا ہے؟"

6 ستمبر 1965، یوم دفاع پاکستان کی تاریخ کے اوراق میں عسکری وجغرافیائی اعتبار سے اُتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ 14 اگست 1947 کی۔ فوج، اسلحہ اور طاقت کے گھمنڈ میں بھارت نے بین الاقوامی سرحد کو عبور تو کر لیا مگر وہ قطعی طور پر اس حقیقت سے بے خبر تھا جنگیں اسلحوں اور فوج کی عددی برتری کی بجائے قومی اتحاد و یگانگت اور اخوت سے جیتی جاتی ہیں۔ یہ وہ دن ہے، جب پاکستان کی مسلّح افواج نے نہ صرف بھارت کو منہ توڑ جواب دیا، بلکہ اس کے کئی علاقوں پر سبز ہلالی پرچم بھی لہرا دیا۔ پاکستانی عوام اور افواج پاکستان نے ایمان، اتحاد اور تنظیم کی بدولت اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن کے مذموم ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔

بھارتی قیادت اور فوج شہر لاہور میں ناشتوں، شراب سے جیت کا جشن اور مال روڈ پر شاستری کو گارڈ آف آنر پیش کرنے کا منصوبہ اپنے ذہنوں میں مکمل طور پر تیار کر چکے تھے مگر جذبہ ایمانی سے سرشار اور جذبہ حب الوطنی سے لبریز پاک فوج نے دشمن کے ناپاک عزائم کی تکمیل

میں ایسا بندھ باندھا کہ تاریخ مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ پاک افواج کے شانہ بشانہ، پاکستان کے غیور عوام نے بھی بہادری وشجاعت کی عظیم داستان رقم کی۔ بھارت کے ناپاک عزائم کو پاک فوج کے جوانوں نے بُری طرح ناکام بناتے ہوئے، اُسے ایسی شکستِ فاش سے دوچار کیا کہ جسے وہ آج تک فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

17 یوم پر مشتمل 1965 کی جنگ نے قوم میں جذبہ حب الوطنی کی نئی روح پھونک دی۔ اس واقع کی چھاپ آج بھی پاکستانی قوم کے دلوں پر واضح نظر آتی ہے۔ اس آزمائش میں ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والوں نے وطن سے والہانہ عقیدت کا عملی مظاہر کیا۔ اس میں عقیدت ومحبت کے جذبات بھی تھے اور ایسے رسیلے گیت بھی جس نے وطن کی فضا سے انسیت کے جذبے کو پروان چڑھایا۔

اگر جنگ ستمبر کے تاریخی پس منظر کا ذکر کیا جائے تو 1962 میں لداخ بارڈر پر چین اور بھارت کے درمیان ہونے والی جنگ بھی ایک اہم سبب ہے۔ بھارتی حکمران چین کے ہاتھوں اس شکست پر تلملائے ہوئے تھے۔ اور وہ اس شکست کا داغ دھونے کیلئے بے چین تھے۔ مگر عالمی سطح پہ مسئلہ کشمیر پر جو تشویش پائی جاتی تھی اس کے پیش نظر دونوں ملکوں پر اس مسئلہ کے پرامن حل کے لئے دباؤ بڑھ رہا ہے۔ اسی دباؤ کا ہی نتیجہ تھا کہ 1963ء میں پاکستان کے وزیر خارجہ بھٹو اور بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ کے درمیان تعمیری اور بامقصد مذاکرات کا آغاز ہوا، جو کہ ہمیشہ کی طرح بھارتی ہٹ دھرمی اور انتہا پسندانہ سوچ کی وجہ سے ناکام ہوگئے۔

جنگ ستمبر کی دوسری بڑی وجہ بھارتی لوک سبھا کی جانب سے 1964 میں کشمیر کی آئینی حیثیت میں ردوبدل بھی ہے، جس کے نتیجہ میں کشمیری صدر و وزیراعظم کا عہدہ ختم کرکے اسے اپنی سٹیٹ کی حیثیت دیدی اور وہاں گورنر اور وزیراعلیٰ کا انتخاب کرکے لوک سبھا میں کشمیر کی 4 نشستیں مقرر کردیں۔ جس کی وجہ سے کشمیری عوام میں بھارت کیخلاف مزید نفرت میں اضافہ ہوا۔ دوسری طرف رن آف کچھ میں پاکستان کی کامیاب فوجی کارروائی کے بعد وزیر خارجہ بھٹو اور عزیز احمد نے کشمیر میں ''آپریشن جبرالٹر'' کا منصوبہ بنایا۔ ایوب خان اس پر نیم دلی سے رضامند تھے بقول ائر وائس مارشل نور خان ''بھٹو نے ایوب کو یقین دلایا کہ کشمیر میں جنگ ہوئی تو امریکہ نے یقین دلایا ہے کہ بھارت پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا''۔ جو کہ صریحاً غلط ثابت ہوا۔

اسی دوران 9 اگست 1965ء کو آزاد کشمیر میں کشمیری حریت پسندوں نے انقلابی کونسل کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے کشمیر میں بغاوت اور بھارتی افواج پر حملوں کا اعلان کردیا، ''صدائے کشمیر'' ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا، 11 اگست کو جموں سرینگر روڈ پر حریت پسندوں نے متعدد پل اور فوج کے اسلحہ کے ڈپو تباہ کردیئے جس کے بعد وادی کشمیر میں بھارتی فوج اور حریت پسندوں کے درمیان جھڑپوں میں شدت آگئی، 12 اگست کو وزیر خارجہ بھٹو نے کہا کہ پاکستان کا کشمیر میں جنگ سے کوئی تعلق نہیں کشمیری عوام نے بھارتی قبضے سے تنگ آکر بغاوت کی ہے، اس لئے بہتر ہے کہ بھارت اس مسئلہ کا حل اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق نکالے۔ مگر اس سے الٹا اثر ہوا۔ اور کشمیر میں بھارتی افواج کی

کارروائیاں مزید بڑھ گئیں۔

18 اگست 1965ء کو کشمیری حریت پسندوں نے پاکستان سے باقاعدہ مدد کی اپیل کر دی جبکہ وزیر خارجہ بھٹو نے ایک مرتبہ پھر بھارت سے کشمیر کے مسئلے کا پرامن حل تلاش کرنے پر زور دیا مگر کشمیر میں حالات قابو سے باہر ہوتا ہوا دیکھ کر بھارت نے 28 اگست سے پاکستان کی سرحدوں پر بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور جنگی کارروائیوں کا آغاز کر دیا جس کے جواب میں پاکستانی افواج کو دفاع وطن کے لئے میدان جنگ میں آنا پڑا۔ پاک فوج نے زبردست کارروائی کرتے ہوئے چھمب جوڑیاں اور دریائے توی کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ بھارت نے ستمبر 1965ء کی 5 تاریخ کو رات کی خاموشی میں پاکستان پر حملہ کر دیا۔

جنگ ستمبر کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ فقط ایک سال قبل ملکی سیاسی جماعتیں متنازع انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کے ہار جانے یا ہرائے جانے پر ایوب حکومت سے نالاں تھیں۔ پھر ایسا کیا جادو ہوا کہ ایوب خان کی جانب سے ریڈیو پاکستان پر ڈیڑھ منٹ کے خطاب نے قوم کو ایک لڑی میں پرو دیا کہ پاکستانی افواج اور عوام کے جذبہ جہاد اور دفاع وطن کی لگن میں فرق کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ ''پاکستانی افواج اور ملک کی سول آبادی'' کا بھارتی جارحیت کو ناکام بنانے کیلئے یوں یکجا ہو گئے تھے کہ فوجی اور سول کا امتیاز کم سے کم رہ گیا، گویا پوری قوم دفاع کے ایک بے مثال عسکری جذبے میں ڈھل گئی کہ بھارت پوری پاکستانی قوم کی ہیبت برداشت نہ کرتے ہوئے شکست فاش سے دوچار

ہوا۔

افواج پاکستان اور پاکستان کے عوام میں یگانگت اور اخوت واتحاد کا عملی مظاہرہ دیکھ کر دشمن کل بھی ناکامی سے دوچار ہوا تھا اور انشاء اللہ! آئندہ بھی ناکامی اس کا مقدر بنے گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستانی قوم جنگ ستمبر کی طرح آج بھی اپنی صفوں میں کمال اتحاد کا مظاہرہ کرے۔ وطن عزیز کو آج بھی اندرونی و بیرونی دشمنوں کی ناپاک سازشوں کا اُسی طرح سامنا ہے جیسے 1965 میں تھا۔ ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کو خصوصاً نوجوان طبقہ کو دشمنوں کے مذموم مقاصد کو پہچاننا ہوگا۔ دشمن قوم کی صفوں میں دراڑیں پیدا کر کے وطن عزیز کو غیر مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے بابائے قوم کے ویژن "ایمان، اتحاد، تنظیم" کو اپناتے ہوئے وطن عزیز کی ترقی وخوشحالی یقینی بنانے کیلئے ذمہ دارانہ کردار نبھانا ہے۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب افواج پاکستان اور عوام کے درمیان محبت کا رشتہ مزید گہرا ہو۔ وطن کی محبت ایمان ہے اور وطن کے محافظ قوم کا مان ہیں۔ پوری قوم، یوم دفاع کے موقع پر عہد کرتی ہے کہ اپنے بہادر شیر جوانوں کیساتھ دفاع وطن کیلئے کندھے سے کندھا ملائے کھڑی تھی، ہے اور رہے گی۔

بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی 78 ویں برسی پر

عتیق انور راجہ
(مصنف صحافی ہیں اور نوائے وقت میں کالم نگار ہیں)

تاریخ کے دامن میں کچھ دن ایسے ہوتے ہیں جو محض نظامِ اوقات کا حصہ نہیں ہوتے بلکہ قوموں کی حیات میں احتساب، تدبر اور اپنے لائحہ عمل کے از سرِ نو جائزے کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ 11 ستمبر کا دن انہی ایام میں سے ایک ہے جب برصغیر کے مظلوم مسلمانوں کو سامراجی تسلط اور متعصب عددی اکثریت کے شکنجے سے نکال کر آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا موقع فراہم کرنے والا عظیم قائد، اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کا رخصت ہونا محض ایک فرد کا سایہ اٹھ جانا نہیں تھا، بلکہ ایک ایسی نومولود ریاست کی چھت کا ہٹ جانا تھا جس کی بنیادیں ابھی استوار ہو رہی تھیں اور جس کے چاروں طرف خطرات و سازشوں کے گرداب گھوم رہے تھے۔ تاہم وہ جس پختہ نظریاتی، اخلاقی اور آئینی بنیاد پر اس ملک کا قصر تعمیر کر گئے تھے، وہ 78 سال گزرنے کے بعد بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنی سمت کا تعاقب کریں اور یہ سوال پوچھیں کہ کیا ہم اس تعبیر کے وفادار رہے جس کے لیے ایک پوری نسل نے اپنے جان، مال اور آبرو کا نذرانہ پیش کیا تھا؟

برصغیر پاک و ہند کی سیاسی و سماجی تاریخ دیکھی جائے تو انیسویں اور بیسویں صدی کے موڑ پر مظلوم، منتشر اور مایوس مسلمان ایک ایسے دوراہے پر کھڑے تھے جہاں ہر راستہ تاریکی اور مستقل غلامی کی طرف جاتا نظر آتا تھا۔ ایک طرف انگریز کی عیارانہ سامراجی حکمتِ عملی تھی جو اقتدار پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کا کھیل کھیل رہی تھی، تو دوسری طرف اکثریت کے غلبے کے زعم میں مبتلا شدت

پسند ہندو قیادت تھی جس کے پاس مسلمانوں کے لیے کسی مساوی شراکتی وجود کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ وہ ستم ظریفانہ دور تھا جہاں برصغیر کا مسلم معاشرہ محرومیوں، تعلیمی زوال اور سیاسی بے وزنی کے تلے دبا ہوا تھا؛ خواب تو بہت سے تھے مگر ان خوابوں کو تعبیر کا روپ دینے والا کوئی دستِ شفقت نہ تھا۔ ایسے ہی کٹھن موڑ پر قدرت نے مسلمانوں کو ایک ایسی قیادت سے نوازا جس نے نہ صرف تاریخ کا دھارا موڑ دیا بلکہ دنیا کے نقشے پر ایک ناقابلِ تسخیر حقیقت رقم کر دی۔ وہ وجودِ گرامی اور عظیم بصیرت کے حامل انسان محمد علی جناح تھے، جنہیں دنیا نے قائدِ اعظم یعنی سب سے بڑا رہنما تسلیم کیا۔

قائداعظم کی شخصیت کو اگر محض ایک روایتی سیاست دان کے ترازو میں تولا جائے تو یہ ان کی تاریخ ساز قامت کے ساتھ شدید ناانصافی ہوگی۔ وہ صرف ایک سیاسی قائد نہیں تھے، بلکہ اصول پسندی، قانون کی پاسداری اور غیر متزلزل عزائم کا وہ عظیم الشان ہمالہ تھے جس سے وقت کی تند و تیز لہریں ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی تھیں۔ جب انہوں نے مسلمانوں کی قیادت کا غبار آلود علم سنبھالا، تو ان کے پاس نہ تو کوئی منظم عسکری قوت تھی، نہ کوئی تسلیم شدہ خطۂ زمین، نہ خزانوں کے ڈھیر اور نہ ہی ذرائع ابلاغ کی پروپیگنڈا مشینری۔ اگر ان کے پاس کچھ تھا تو وہ صرف ایک اٹل نظریاتی موقف، سچائی اور راست بازی کی طاقت، بے داغ کردار اور ایک ایسا یقینِ محکم تھا جو دنیا کے بڑے سے بڑے دباؤ یا ترغیب کے سامنے جھکنے سے صاف انکار کر دیتا تھا۔ برطانوی سامراج اپنی تمام تر سیاسی چالاکیوں اور آئینی داؤ پیچ کے ساتھ سامنے تھا، تو دوسری جانب عددی قوت کے گھمنڈ میں تنے ہوئے کانگریسی رہنما موجود تھے۔ ان دونوں طاقتوں کے درمیان اگر کوئی تنِ تنہا آہنی دیوار بن کر کھڑا رہا، تو وہ محمد علی جناح تھے۔ انہوں نے اپنی سیاسی جدوجہد کے دوران کبھی جذباتی نعروں، کھوکھلے وعدوں یا وقتی نفع و نقصان کا سہارا نہیں لیا۔ ان کی سیاست کی بنیاد سچائی، منطق اور قانون کے ٹھوس اصولوں پر استوار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سخت ترین سیاسی حریف اور انگریز مدبرین بھی ان کی بے مثال دیانت داری، تیز فہم ذہانت اور اصول پسندی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔

قائداعظم نے جس گہری باریک بینی سے ہندوستانی سیاست اور معاشرت کی ساخت کا مطالعہ کیا تھا، اس نے انہیں بالآخر اس حتمی حقیقت تک پہنچایا کہ برصغیر کے مسلمان محض کوئی اقلیت نہیں ہیں جو آئینی ترامیم یا چند مراعات سے مطمئن ہو سکیں، بلکہ وہ ہر لحاظ سے ایک مکمل قوم ہیں۔ ان کا اپنا کلچر، اپنی ضخیم تاریخ، اپنا طرزِ زندگی اور اپنی منفرد اخلاقی اقدار ہیں۔ انہوں نے وقت کے جابروں کو للکار کر اور واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ مسلم قوم ہر لحاظ سے ایک الگ قوم ہے؛ ہمارے پاس اپنا الگ فلسفۂ حیات ہے، اپنی تہذیب ہے، اپنی تاریخ ہے اور اپنے مقاصدِ حیات ہیں، ہم کسی دوسرے قومی دھارے میں مدغم یا جذب ہونے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ یہ کوئی وقتی سیاسی نعرہ یا مفاہمتی کارڈ نہیں تھا، بلکہ برصغیر میں مسلمانوں کے ہزار سالہ وجود کی تاریخ کا نچوڑ اور دو قومی نظریے کی وہ سچی اور ٹھوس بنیاد تھی جس نے جنوبی ایشیا کے کروڑوں بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک نقطے پر متحد کر دیا۔ وہ مسلمان جو جغرافیائی فاصلوں، زبانوں، علاقائی کلچروں اور قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، جناح کی

ایک شفاف اور سچی آواز پر "پاکستان کا مطلب کیا...لا الٰہ الا اللہ" کے آفاقی ترانے کے زیرِ اثر ایک فولادی زنجیر کی کڑیاں بن گئے۔

دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو آزادی کی بیشتر تحریکیں خوزیز جنگوں، گوریلا کارروائیوں، مسلح بغاوتوں اور تشدد کی تلخ داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔لیکن قائداعظم محمد علی جناح کی قائدانہ بصیرت کا لازوال شاہکار یہ تھا کہ انہوں نے دنیا کی سب سے بڑی سامراجی طاقت اور متعصب اکثریت سے اپنی قوم کی آزادی کا پروانہ صرف اور صرف قانون، آئین، دلیل اور قلم کی طاقت سے حاصل کیا۔ان کی گفتگو میں سطحی تلخی یا جذباتیت کے بجائے استدلال کا بھاری وزن ہوتا تھا۔ان کے خطابات سیاسی نعرہ بازی کے بجائے تدبر، فہم اور قانونی حکمت سے لبریز ہوتے تھے۔لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے لے کر گاندھی اور نہرو تک، کوئی بھی بڑا رہنما میز پر بیٹھ کر قائداعظم کی منطق کا مقابلہ نہ کر سکا۔انہوں نے دنیا پر ثابت کر دکھایا کہ اگر رہنما کا کردار سچا، نیت صاف اور مقصد پاکیزہ ہو، تو بندوقوں اور گولیوں کے بغیر بھی عظیم ترین سلطنتوں کے غرور کو آئینی جدوجہد سے خاک میں ملایا جا سکتا ہے۔

بالآخر وہ تاریخی اور مبارک دن بھی آ پہنچا جس کا خواب مفکرِ اسلام علامہ محمد اقبال نے دیکھا تھا اور جس کی عملی تعبیر قائدِاعظم نے اپنے خونِ جگر اور شب و روز کی محنت سے تراشی تھی۔14 اگست 1947 کو دنیا نے ایک معجزہ دیکھا کہ ایک ایسا ملک جو دنیا کے جغرافیائی نقشے پر موجود نہ تھا، اچانک ایک آزاد اور خودمختار ریاست کی صورت میں ابھر آیا۔ایک ایسی قوم جو بکھری اور دبی ہوئی تھی، خطے کی ایک عظیم اور باوقار ریاست کی مالک بن گئی۔ یہ کامیابی کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا، بلکہ قائداعظم کی انتھک محنت، مسلسل جدوجہد اور ان کی بری طرح گرتی ہوئی صحت کی قیمت پر

حاصل ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا، ان کے پھیپھڑے خطرناک حد تک جواب دے رہے تھے اور تپ دق کا مرض ان کے وجود کو اندر سے چاٹ رہا تھا، مگر قائد کے سامنے اپنا آرام یا اپنی ذات نہیں بلکہ کروڑوں مسلمانوں کی آزادی اور قوم کا روشن مستقبل تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آخری قطرۂ خون بھی اس ریاست کی بنیادوں کو سینچنے اور اسے مستحکم کرنے میں صرف کر دیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد کے مختصر سے 13 ماہ کے عرصے میں قائداعظم نے اس نوخیز اور مشکلات میں گھری ریاست کو جو فکر اور سمت عطا کی، وہ آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ انہوں نے قوم کو اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم کے تین زریں اصول عطا کیے؛ یعنی زبان، رنگ، نسل، صوبائیت اور فرقہ واریت کی تفریق سے بالاتر ہو کر ایک یکجا قوم بننا، زندگی کے ہر شعبے میں نظم وضبط اور قانون کی بالادستی قائم رکھنا، اور اپنے مقاصد، صلاحیتوں اور رب کریم کی ذات پر پختہ ایمان رکھنا۔ ان کا واضح اور غیر مبہم فرمان تھا کہ پاکستان تمام شہریوں کا بلاتفریقِ مذہب وعقیدہ ملک ہے، جہاں اقلیتوں کو مکمل آزادی، تحفظ اور مساوات حاصل ہو گی۔ انہوں نے ایک ایسی جدید اور فلاحی اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا جو عدل وانصاف، مساوات، میرٹ اور معاشی توازن پر مبنی ہو۔

آج جب قائداعظم کی 78 ویں برسی کے موقع پر ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنے حالات پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ہم معاشی بحرانوں، سیاسی عدمِ استحکام، صوبائی ولسانی تفریق اور اخلاقی تنزلی کے بھنور میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ قائد کے افکار اور

اصولوں سے ہماری انحراف اور غفلت ہے۔ قائداعظم کا پاکستان محض ایک جغرافیائی خطہ نہیں تھا، بلکہ ایک ایسی اخلاقی اور فکری عمارت کا نام تھا جہاں قانون سب کے لیے برابر ہو، جہاں سفارش کاری اور رشوت کے بجائے میرٹ کا راج ہو، اور جہاں ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دی جائے۔ اگر آج ہم اپنے بابائے قوم کو سچی خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں محض ان کی تصاویر کی نمائش، سرکاری تقریبات اور کھوکھلے نعروں تک محدود رہنے کے بجائے ان کی صفات کو اپنے اندر ڈھالنا ہوگا۔ ہمیں صوبائیت، ذات پات، فرقہ واریت اور ذاتی مفادات کے تنگ خول سے باہر نکل کر ایک مرتبہ پھر "ایک قوم" بننا ہوگا۔ قائداعظم محمد علی جناح صرف ماضی کا ایک بند باب یا تاریخ کی کوئی شخصیت نہیں ہیں، بلکہ وہ ہمارا حال اور ہمارا روشن مستقبل ہیں۔ وہ ایک ایسا درخشندہ ستارہ ہیں جو اندھیری راتوں میں سچائی، آئین اور منزل کا راستہ دکھاتا ہے۔ جب تک اس قوم کے سینے میں حبِ وطنی اور ایمان کا جذبہ موجزن ہے، میرا قائد جنہیں دنیا قائداعظم کے نام سے پکارتی ہے۔ ہر پاکستانی کے دل میں زندہ ہے اور رہے گا۔

پاکستان، ترکیہ اور سعودی عرب کا اتحاد

مکہ جوائنٹ ڈیفنس ایگریمنٹ

اسماء بابر
(۶ کتابوں کی مصنفہ ہیں نوائے وقت کی کالم نگار ہیں ماہنامہ ہلال کی مستقل لکھاری ہیں اور ریڈیو لاہور کی کمپیئر ہیں)

پاکستان ترکیہ اور سعودی عربیہ کے درمیان گزشتہ ہفتے مکہ ومکرمہ میں طے پانے والا دفاعی معاہدہ جس کو مکہ ڈیفنس پیکٹ بھی کہا جا رہا ہے تاریخی لحاظ سے بھی بہت اہم ہے اور یہ ہر لحاظ سے ان تینوں ممالک کے لیے بالخصوص اور خطے کے لیے بالاعموم آئندہ آنے والے وقت میں ایک بڑا اسیر حاصل اور دیرپا دفاعی معاہدہ انشاء اللہ تعالی ثابت ہوگا۔ اس دفائی معاہدے کے جو خدوخال ہیں ان کے مطابق ان تینوں ممالک نے ایک معاہدے پہ دستخط کیے ہیں سعودی عربیہ کے شہر مکۃ المکرمہ میں جو کہ تمام مسلمانوں کے لیے سب سے مقدس ترین جگہ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ شہر جس میں یہ معاہدہ طے پایا ہے وہ مکہ المکرمہ ہے اور جس دن کا چناؤ کیا گیا ہے وہ جمعۃ المبارک ہے۔ تو اس حوالے سے بھی یہ بڑی مبارک جگہ، مبارک موقع اور دن بھی تھا۔ ہماری اسلامی تاریخ کے حوالے سے بھی اس معاہدے کی جو مختلف شقیں ہیں ان میں سب سے خاص شق یہ ہے کہ تینوں ممالک میں سے کسی ایک ملک کے خلاف اگر جارحیت ہوتی ہے، حملہ ہوتا ہے تو وہ حملہ تینوں ممالک پر حملہ تصور کیا جائے گا اور پھر تینوں ممالک اس جارح کے خلاف مشترکہ کاروائی کریں گے، مشترکہ ردعمل دیں گے اور یہی اس کی سب سے اہم شرط ہے۔ یہ معاہدہ بنیادی طور پر ایک دفائی معاہدہ ہے اس میں کہیں پر ذکر نہیں کیا گیا کہ اس معاہدے کی کسی جارحیت سے کوئی بھی تعلق ہے یا اس کے اندر کوئی ایسی شق ہے کہ تینوں ممالک میں سے کوئی ایک اگر دوسرے کے خلاف حملہ کرتا ہے تو دوسرے بھی اس حملے میں شامل ہوں گے یہ ایک مکمل دفائی معاہدہ ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ خطہ جس میں پاکستان، سعودی عربیہ اور ترکی واقع ہیں یعنی کہ مشرق وسطی کا خطہ، خلیج جسے گلف کہتے ہیں اور جنوبی ایشیا، ترکیہ چونکہ ایسا ملک ہے جو کہ یورپ اور ایشیا دونوں میں واقع ہیں ریڈ سی Red sea کے اوپر اس کی اپنی

ایک اہمیت ہے۔تاریخ اور جغرافیائی حوالے سے تینوں مما لک مختلف حوالوں سے بہت سی خصوصیات کی بھی حامل ہیں۔مثال کے طور پر پاکستان کے پاس دنیا کی بہترین فوج ہے۔ایک ایسی فوج جس نے پچھلے سال گزشتہ برس مئی میں ہندوستان کی جارحیت کے مقابلے میں معرکہ حق کے دوران پوری دنیا کے سامنے اپنی طاقت اور بہادری کا لوہا منوایا اور دنیا نے اس کو مانا بھی، دیکھا کہ پاکستان کی فوج کتنی نڈر، بے باک اور جذبہ جہاد سے معمور ہے۔اس کے علاوہ پاکستان جوہری طاقت بھی ہے۔اسلامی دنیا کا پہلا ایٹمی ملک ہے۔پاکستان 25 کروڑ کی آبادی پر مشترک اور دنیا کا پانچویں نمبر پہ آبادی کے لحاظ سے بڑا ملک ہے۔ پاکستان کے لوگ ہنر مند بھی ہیں دنیا کے مختلف مما لک میں ان کی تعمیر و ترقی میں لاکھوں پاکستانی آج بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔پاکستان کے شہری پاکستان کے رہنے والے اسلام سے سچی محبت کرتے ہیں۔سعودی عریبیہ کی اسلامی دنیا میں ایک اپنی اہمیت ہے۔یہ ملک رقبے کے لحاظ سے بھی بڑا ہے، تیل کی دولت سے مالا مال بھی ہے۔اس کی معیشت بہت مضبوط ہے۔اپنے ارد گرد کے مما لک کو دیکھیں تو نسبتاً دوسروں کے لحاظ سے دفاعی طور پہ بھی مضبوط ہے۔ترکیہ ایک بہت پرانا تاریخی ملک ہے۔یہ پرانی تہذیب کا مالک ہے۔ریڈسی میں واقع ہے۔دفاعی سند ترکیہ کی بہت ترقی یافتہ ہے وہاں پر جہاز، سرویلنس کے ہتھیار، ڈرون، بحری جہاز اور دوسرا اسلحہ گولا بارود بنتا ہے۔خود دفاعی سند کے لحاظ سے اور معاشی طور پر بھی ترکی ایک بڑا مضبوط ملک ہے۔یہ تینوں مما لک اپنی اپنی خصوصیات اور جوان کی انفرادی طاقت ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے کی بہت مدد کر سکتے ہیں۔ پہلے بھی کر رہے ہیں آگے چل کے مزید اس دفاعی معاہدے کے تحت ایک دوسرے کی بڑھ چڑھ کر مدد کر سکتے ہیں اور اب جو مدد ہوگی جو ایک دوسرے کے ساتھ نبھایا جائے گا وہ اصولی اور قانونی لحاظ سے بھی مستند ہوگی۔ان ملک میں ہنر مند افراد بالخصوص پاکستان جیسا ملک بھیج کے مدد کر سکتا ہے پھر اس کے بعد جو تینوں مما لک کی افواج ہیں ان کے باہمی ایکسر سائز ہوں گی ٹریننگ کے علاقوں میں آمد و رفعت ہوگی۔ پیشہ وارانہ لحاظ سے بہت ساری چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ تبدیل کی جاسکتی ہیں۔آپس میں تینوں افواج کا تعاون بڑھے گا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ دفاعی معاہدہ دنیا کے مسلمہ مروجہ قوانین و اصولوں کے عین مطابق ہے۔نیٹو بھی اسی طرح بنا تھا نیٹو مما لک بھی ایک شرط پر متفق ہوئے ہیں کہ کسی ایک نیٹو ملک کے خلاف جارحیت تمام نیٹو مما لک کے خلاف جارحیت تصور ہوگی۔تو اس لیے کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ معاہدہ غیر قانونی ہے یا یہ آج کی دنیا میں شاید اس طریقے سے معاہدہ ہو نہیں سکتا۔ ہاں اس معاہدے سے پریشانی ہے تو ہمارے دشمن دین و وطن اسرائیل کو ہے معاہدے سے پریشانی ہے تو ازلی دشمن ہندوستان کو ہے وہ بھی یہ دونوں مما لک جارحانہ عزائم رکھتے ہیں توسیع پسندانہ عزائم رکھتے ہیں، گاہے بگاہے اپنے ہمسایہ مما لک کے خلاف جارحیت کر چکے ہیں، ہندوستان کئی مرتبہ پاکستان کے خلاف نہ صرف جارحیت بلکہ دہشت گردی کے المناک دلسوز حملے کر چکا ہے اسرائیل آئے روز کبھی لبنان پہ کبھی شام پہ جارحیت کرتا ہے۔ایران کے اوپر تو امریکہ کے ساتھ مل کے پانچ مہینے سے ایک جنگ مسلط کی ہوئی ہے۔اس کے علاوہ فلسطینیوں کے خلاف پچھلے 80 سال سے ظلم و بربریت کے عمل نے انسانیت کے چیتھڑے اڑا دیئے ہیں۔ یہ حقائق ساری دنیا کے سامنے

ہے۔ان دونوں مما لک کو یقینی طور پر اس معاہدے کی تشویش بھی ہے ہونی بھی چاہیے۔کسی امن پسند ملک کو کسی ایسے ملک کو جس کے عزائم جارحانہ نہیں ہے جو ترقی پہ۔ باہمی تعاون پہ اور امن پہ یقین رکھتا ہے اس کو اس معاہدے سے کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ہمارا خطہ جو ہے اس میں بہت عرصے سے جنگیں بھی ہوتی رہی ہیں بربریت کا نشانہ معصوم لوگ بنتے رہے ہیں۔اس لیے اس خطے کی سلامتی کے لیے اس خطے میں امن کے لیے اس طرح کا معاہدہ بہت ضروری تھا اور ابھی اس بات کے کافی حد تک امکانات ہیں کہ آگے چل کے اس خطے کے اور مما لک بھی اس معاہدے میں شامل ہو سکتے ہیں کچھ مما لک نے تو اپنی خواہش کا اظہار کیا بھی ہے جس میں ایک کویت بھی ہے اس کا پاکستان سے مختلف

نوعیت کا دفاعی معاہدہ پہلے سے موجود ہے صومالیہ نے بھی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ لیبیا کی بھی سیاسی خبریں آئی ہیں۔ دوسرے مما لک میں قطر بھی اس طرح کی خواہش رکھتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر امریکہ اور ایران کی جنگ اسلام آباد ایم او یو کی روشنی میں ختم ہوتی ہے اور دیرپا معاہدہ عمل میں آتا ہے تو کوئی بعید نہیں ہے کہ کل ایران بھی اس معاہدے میں شامل ہو کیونکہ ایران کو سب سے زیادہ ضرورت ہے اپنی حفاظت کی، قومی سلامتی ایک ایسا ایجنڈا اور ضرورت ہے کہ کوئی بھی قوم و ملک اس کو نظر انداز یا اس سے سمجھوتہ نہیں کرتا۔ ہر ملک کو اپنی قومی سلامتی کی فکر ہوتی ہے اپنے دفاع کے لیے اپنی قوم سلامتی کے تحفظ کے لیے کوئی بھی ملک بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں اگر کوئی بھی قدم اٹھاتا ہے تو اس کو اس کا پورا حق حاصل ہے اس کو اس سے کوئی نہیں روک سکتا ہر آزاد ملک کو حق حاصل ہے کہ اپنی قومی سلامتی کے تحفظ کو یقینی بنائیں اس میں کوئی دورائے ہو

ہی نہیں سکتی اور کچھ ممالک بالخصوص ہندوستان اور اسرائیل جیسے ممالک اس کو اسلامک نیٹو کا نام دے رہا ہے۔کوئی اس کو سنی اتحاد کا نام دے رہا صرف اور صرف ایک افراتفری اور انتشار پھیلانے کے لیے۔اپنے اندر کا بغض ختم کرنے کے لیے وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔کہیں پہ نہیں لکھا اس معاہدے میں غیر اسلامی ملک بھی شامل ہوسکتا ہے اور اگر کل کو اس میں ایران شامل ہو گیا تو پھر یہ کیسے ان کی بات سچ ثابت ہوگی کہ یہ سنی اتحاد ہے یا سنی الائنس ہے۔یہ کسی مذہب کے نام پہ نہیں بنا کسی فرقے یا فقہ کے نام پہ نہیں بنا یہ شریعت خالصتاً ان تینوں ممالک نے سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے اس معاہدے پر دستخط کیے ہیں اور اس معاہدے کی وجہ سے آگے چل کے صرف دفاع تک تعاون محدود نہیں رہے گا اپ دیکھیں گے کہ اقتصادی میدان میں بھی اس معاہدے کی وجہ سے بہت ترقی ہوگی آگے سعودی عربیہ کی بلینز آف ڈالرز کی پاکستان میں انویسٹمنٹ ابھی ہونی ہیں ان شاء اللہ۔اس کا بہت جلد اعلان بھی ہوگا خاص طور پٹرولیم کے سیکٹر میں پاکستان بہت تعداد میں ترکی سے اسلح گولا بارود خرید سکتا ہے۔ترکی اور سعودی عربیہ پاکستان سے ہنرمند افرادی قوت لے سکتے ہیں پاکستان کی دفاعی صلاحیت سے فائدے اٹھا کے اپنی فوج کو مزید مضبوط کر سکتے ہیں۔ایک اور بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس معاہدے تک پہنچنے کے لیے جہاں تک ان تینوں ممالک کی قیادت کا اس میں ہاتھ ہے۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تینوں ممالک کی قیادت پاکستان کے وزیر اعظم شہباز شریف صاحب پاکستان کے آرمی چیف فیلڈ مارشل عاصم منیر، سعودیہ کے ولی عہد محمد بن سلمان اور ترکیہ کے صدر رجب طیب اردگان۔ان چاروں کی آپس میں جو ذہنی ہم آہنگی، ذاتی تعلق اور دوستی ہے اس نے بھی اس معاہدے کو حتمی شکل دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا کیونکہ جب قیادتوں کے آپس میں تعلقات ذاتی نوعیت کے اس طریقے سے ہو جائیں تو اس کا فائدہ ان کی اقوام کو ہوتا ہے اور یہ ہم دیکھ بھی رہے ہیں۔تمام امن پسند لوگ جو امن چاہتے ہیں اس خطے میں کچھ معاہدے سے خوش ہیں دنیا کے کئی ممالک نے اس کو دل سے قبول کیا ہے کسی نے کھل کے اس کی مخالفت نہیں کی وجہ ہم سب کو پتہ ہے کہ خالصتاً دفاعی معاہدہ ہے۔مخالف وہی دو ہیں اسرائیل اور ہندوستان، وہ رہیں گے لیکن ہمیں ان کی پرواہ کیے بغیر مثبت طریقے سے نیک نیتی سے آگے بڑھنا ہے اپنے عوام کی تعمیر و ترقی کے لیے خوشحالی کے لیے علاقے میں امن کے لیے بلا خوف و خطر کیونکہ اس خطے کے لوگوں کا بھی تو حق ہے امن سے رہنا۔یہ دنیا کا بہت اہم خطہ ہے جنوبی ایشیا مشرق وسطی اور خلیج کا خطہ جو ہے اور اس خطے میں دنیا کی آپ دیکھیں تو ایک تہائی سے زیادہ آبادی رہتی ہے۔معدنیات کی دولت سے مالا مال پاکستان بھی ہے۔سعودی عربیہ بھی ہے اور تجارتی لحاظ سے جغرافیہ کے لحاظ سے ترکیہ بہت اہم ہے۔کیونکہ ترکیہ کے ریڈسی کے رستے سے ساری Russian امپورٹ ایکسپورٹ وہیں سے گزرتی ہے۔یہ تاریخی معاہدہ ہے کہ اس میں بجا طور پر اور پاکستانیوں کو ہر سعودی عربیہ کے رہنے والے کو ترکیہ کے ہر شہری کو اور خطے میں رہنے والوں کو امن پسند لوگوں کو خوشی کا اظہار کرنا چاہیے۔خراج تحسین پیش کرنا چاہیے ان تینوں ممالک کی قیادتوں کو پاکستان کے وزیر اعظم شہباز شریف، پاکستان کے آرمی چیف فیلڈ مارشل عاصم منیر، سعودی عربیہ کے ولیعہد محمد سلمان اور ترکیہ کے صدر رجب طیب اردگان کو ان کی لیڈرشپ کو ان کی بصیرت کو کہ جو انہوں نے یہ قدم

اٹھایا ہے شخصیات آتی جاتی رہتی ہیں اقوام نے ہمیشہ زندہ رہنا ہوتا ہے اس طرح کے معاہدے اس طرح شخصیات تک محدود نہیں ہوتے امید ہے آگے چل کے یہ معاہدہ مزید وسعت پائے گا اس میں تعاون مزید آگے بہتر ہوگا اور ممالک اس میں شامل ہوں گے امن کی نوید لے کر آئے گا اور اس کے ثمرات ان تین ممالک کے عوام کو بالخصوص پہنچیں گے بھی ملیں گے ان شاء اللہ۔ جو کہ ہر شخص کی خواہش ہے۔ حرمین شریفین ہر مسلمان کے دل کے بہت قریب ہیں اور اس کا تحفظ ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے پاکستان خوش قسمت ہے کہ ہمارا پہلے سے پچھلے سال سے سعودی عربیہ کے ساتھ ایک معاہدہ موجود ہے۔ تو ابھی ہم بھی یہ بجا طور پہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر پاکستانی حرمین شریفین کا عملی طور پر محافظ بھی ہے اللہ کرے یہ معاہدہ جس نیت روح کے مطابق کیا گیا اس میں کامیابی ہو اور اس علاقے میں خطے میں امن ہو عوام خوشحال ہوں ترقی پائیں اسلامی دنیا میں بھی بھائی چارہ بڑھے اتحاد و یگانگت بڑھے اسلام دشمن اور امن دشمن قوتیں جو ہیں ان کو اس طرح کے معاہدوں کی صورت میں ایک یکجا دشمن کا مخالفت کا یقینی طور پر سامنا ہوگا جو کہ ان کے لیے یہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے لیکن ہم سب کے لیے اچھی خبر ہے ہمارے کچھ لوگ اپنے سیاسی مفاد کے لیے مخالفت برائے مخالفت کے لیے اور سیاسی فائدے کے لیے سمجھے بغیر تفصیل میں جائے بغیر اس معاہدے کی مخالفت کچھ کھل کے کر رہے ہیں کچھ دبے الفاظ میں کر رہے ہیں ان کو یقیناً اس چیز کا احساس ہونا چاہیے کہ اپنے ملک کی سلامتی سے آگے کوئی چیز نہیں ہے سیاست ضرور کریں لیکن اپنے ملک کی سلامتی کے اوپر تحفظ کے اوپر اپنے فوج کی مضبوطی اور بقا کے لیے اس کی خاطر یا اس کے ساتھ منسلک کوئی سیاست نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس پہ ہر پاکستانی متحد ہے اور ہونا بھی چاہیے اگر کسی وجہ سے اس لیڈرشپ کو کریڈٹ ملتا ہے جو کہ اپ کو اچھی نہیں لگتی تو وہ تو پھر اللہ کی بانٹ ہے جس کو چاہے عزت سے نوازے۔ ہم سب کی سیاست معیشت معاشرت سب کچھ اسی وطن سے منسلک ہے۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان

ELECTION COMMISSIONS OF PAKISTAN

GOVERNMENT OF THE STATE OF AZAD JAMMU & KASHMIR

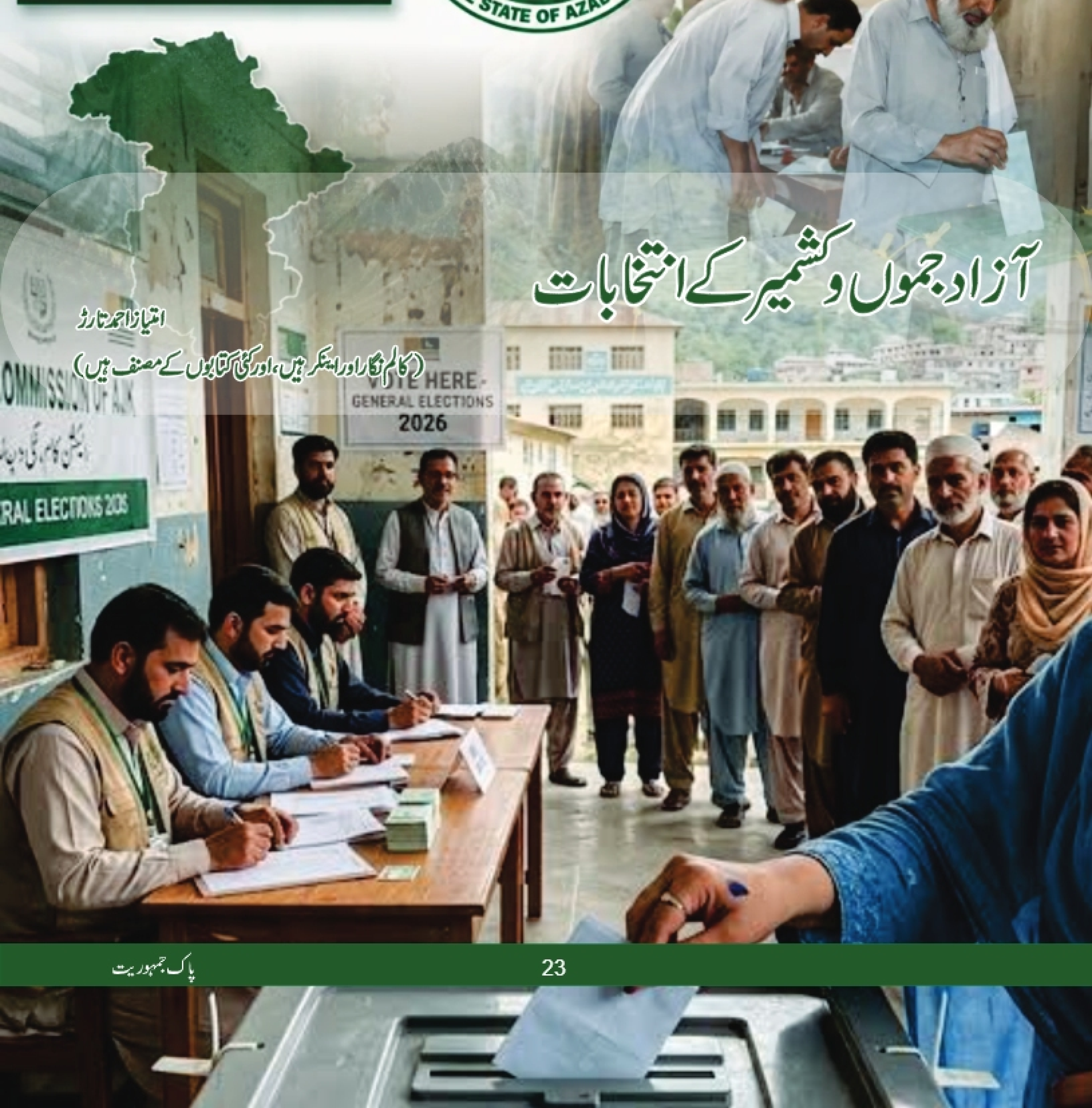

آزاد جموں و کشمیر کے انتخابات

امتیاز احمد تارڑ

(کالم نگار اور اینکر ہیں، اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں)

آزاد جموں وکشمیر کی سیاست ایک اہم موڑ سے گزر کر نئے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ مسلم لیگ نون کے بیرسٹر سید افتخار علی گیلانی 28 اگست 2026ء کو مظفر آباد میں منعقدہ اسمبلی اجلاس میں آزاد جموں وکشمیر کے 17 ویں وزیرِ اعظم منتخب ہو گئے اور اپنے عہدے کا حلف بھی اٹھالیا۔ اس طرح آزاد کشمیر میں کئی روز سے جاری سیاسی گہما گہمی اپنے منطقی انجام کو پہنچی اور نئی حکومت کے قیام کا باضابطہ آغاز ہو گیا۔

قانون ساز اسمبلی میں مسلم لیگ نون 32 نشستوں کے ساتھ سب سے بڑی جماعت ہے، جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی کی جانب سے سردار مختار احمد خان کو وزارتِ عظمیٰ کے لیے میدان میں اتارا گیا تھا، جن کے پاس 16 ارکان کی حمایت موجود تھی۔ وزیرِ اعظم منتخب ہونے کے لیے 27 ووٹ درکار تھے اور واضح عددی برتری کی بنیاد پر بیرسٹر افتخار علی گیلانی نے یہ معرکہ آسانی سے سر کر لیا۔ اب جبکہ انتخاب اور حلف برداری کا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے، توجہ اس بات پر مرکوز ہو گئی ہے کہ نئی حکومت خطے کو درپیش سنگین مسائل سے نمٹنے کے لیے کیا عملی حکمتِ عملی اختیار کرتی ہے۔ عام شہری کے لیے یہ بات اتنی اہم نہیں کہ حکومت کس جماعت کی بنی، جتنی اہمیت اس سوال کو حاصل ہے کہ نئی حکومت بجلی، روزگار، مہنگائی، صحت، تعلیم، سڑکوں، سیاحت اور انتظامی مسائل کے حل کے لیے کیا اقدامات کرتی ہے۔ ماضی میں بھی مختلف جماعتوں نے عوام سے بڑے بڑے وعدے کیے، مگر اقتدار میں آنے کے بعد ان وعدوں کو عملی شکل دینے میں کئی رکاوٹیں سامنے آتی رہیں۔

بیرسٹر افتخار علی گیلانی کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ ہوگا کہ وہ اسمبلی میں حاصل عددی اکثریت کو عوامی اعتماد میں تبدیل کریں۔ وزارتِ عظمیٰ کا منصب صرف ووٹ حاصل کرنے سے مضبوط نہیں ہوتا بلکہ اصل طاقت عوامی خدمت، شفاف حکمرانی اور مؤثر انتظامی کارکردگی سے پیدا

ہوتی ہے۔ اگر نئی حکومت عوام کو فوری ریلیف دینے میں کامیاب رہتی ہے، تو اس کی سیاسی ساکھ مضبوط ہو گی لیکن اگر پرانے مسائل برقرار رہے تو عوامی مایوسی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ آزاد جموں و کشمیر کا سب سے اہم مسئلہ معاشی کمزوری اور روزگار کے محدود مواقع ہیں۔ خطے کے نوجوان تعلیم مکمل کرنے کے بعد سرکاری ملازمتوں کے منتظر رہتے ہیں، جبکہ نجی شعبہ اتنا مضبوط نہیں کہ بڑی تعداد میں روزگار پیدا کر سکے۔ بہت سے نوجوان پاکستان کے بڑے شہروں یا بیرونِ ملک جانے پر مجبور ہیں۔ نئی حکومت کو چاہیے کہ وہ روزگار کے لیے صرف سرکاری آسامیوں پر انحصار نہ کرے بلکہ صنعتی زونز، چھوٹی صنعتوں، زرعی کاروبار، فنی تربیت، آئی ٹی، فری لانسنگ اور نوجوانوں کے لیے آسان قرضوں کا نظام متعارف کرائے۔

سیاحت آزاد کشمیر کی معیشت کے لیے ایک بڑا موقع ہے۔ نیلم ویلی، وادی جہلم، راولاکوٹ، باغ، حویلی، سدھنوتی اور دیگر علاقوں میں قدرتی حسن کے بے شمار مقامات موجود ہیں۔ مگر سیاحت کے فروغ کے لیے صرف خوب صورت مناظر کافی نہیں۔ بہتر سڑکیں، صاف پانی، مناسب رہائش، انٹرنیٹ، بجلی، صفائی، طبی امداد، ریسکیو سروس اور ٹریفک کا منظم نظام بھی ضروری ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ سیاحت کو غیر منظم ہجوم کے بجائے ایک باقاعدہ صنعت کا درجہ دے اور مقامی لوگوں کو ہوٹلنگ، ٹور گائیڈ، دستکاری، ٹرانسپورٹ اور خوراک کے کاروبار میں شامل کرے۔ بجلی کا مسئلہ آزاد کشمیر کے عوام کے لیے ایک حساس اور دیرینہ معاملہ ہے۔ یہ خطہ پانی کے وسیع ذخائر رکھتا ہے اور یہاں پن بجلی پیدا کرنے کے وسیع امکانات موجود ہیں، مگر اس کے باوجود کئی علاقوں میں لوڈشیڈنگ، کم وولٹیج اور مہنگی بجلی کی شکایات سامنے آتی رہتی ہیں۔ نئی

حکومت کو اس مسئلے پر وفاقی حکومت کے ساتھ سنجیدہ مذاکرات کرنے چاہییں اور ایسا شفاف نظام وضع کرنا چاہیے، جس میں آزاد کشمیر کی ضروریات، بجلی کے نرخ اور پن بجلی منصوبوں کے فوائد کو منصفانہ انداز میں شامل کیا جائے۔

تعلیم کے شعبے میں بھی اصلاحات ناگزیر ہیں۔ معیارِ تعلیم، اساتذہ کی دستیابی، جدید نصاب، سائنس لیبارٹریوں اور فنی تربیت کے مسائل اب بھی برقرار ہیں۔ صحت کا شعبہ بھی عوامی توجہ کا طلب گار ہے۔ دیہی علاقوں کے بنیادی مراکزِ صحت میں اکثر ڈاکٹر، ادویات اور ایمرجنسی سہولتیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ ضلعی اور تحصیل سطح کے اسپتالوں کو فعال بنانا نئی حکومت کی ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے۔

آزاد کشمیر کا پہاڑی جغرافیہ بھی حکومتی منصوبہ بندی کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ بارش، برف باری، لینڈ سلائیڈنگ اور زلزلوں کے باعث سڑکیں اکثر بند ہو جاتی ہیں۔ سڑکوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ حفاظتی دیواریں، مضبوط پل اور فوری امدادی نظام قائم کرنا ضروری ہے۔ انتظامی کمزوریاں، سفارش، کرپشن اور سرکاری اداروں کی سست روی بھی عوامی مسائل میں اضافہ کرتی ہے۔ نئی حکومت کو سرکاری خدمات کو زیادہ سے زیادہ آن لائن کرنا چاہیے اور عوامی شکایات کے ازالے کے لیے مؤثر نظام بنانا چاہیے۔ بلدیاتی اداروں کو با اختیار بنانا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے، تاکہ دور دراز علاقوں کے مسائل مقامی سطح پر ہی زیادہ تیزی سے حل کیے جا سکیں۔

دوسری جانب پیپلز پارٹی نے سردار مختار احمد خان کو امیدوار نامزد کر کے مقابلے کو سیاسی طور پر زندہ رکھا، اور اب اسمبلی میں 16 ارکان

کے ساتھ وہ ایک مضبوط اپوزیشن کا کردار ادا کر سکتی ہے۔اپوزیشن کا کام صرف حکومت پر تنقید کرنا نہیں بلکہ قانون سازی میں حصہ لینا، بجٹ کا جائزہ لینا اور متبادل پالیسی پیش کرنا بھی ہے۔اگر پیپلز پارٹی تعمیری اپوزیشن کا کردار ادا کرتی ہے تو جمہوری نظام مضبوط ہوگا۔

بیرسٹر افتخار علی گیلانی کی حلف برداری کے بعد اب حکومت سازی اور کابینہ کی تشکیل کا مرحلہ شروع ہوگا۔حقیقت یہ ہے کہ آزاد کشمیر کے عوام سیاسی نعروں سے آگے بڑھ کر عملی تبدیلی چاہتے ہیں۔انہیں ایسی حکومت درکار ہے جو بجلی کے مسئلے کو سنجیدگی سے حل کرے، نوجوانوں کے لیے روزگار پیدا کرے، سیاحت کو صنعت بنائے، تعلیم اور صحت کا معیار بہتر کرے اور سرکاری اداروں میں میرٹ و شفافیت قائم کرے۔

نئی حکومت کو یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ اقتدار عوام کی امانت ہے۔اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنا ایک سیاسی کامیابی ضرور ہے، لیکن عوامی مسائل حل کرنا اس سے کہیں بڑی ذمہ داری ہے۔آزاد جموں و کشمیر کا مستقبل سیاسی کشمکش سے زیادہ اچھی حکمرانی، معاشی منصوبہ بندی، عوامی شمولیت اور شفاف انتظام سے وابستہ ہے۔اگر نئی قیادت اپنے وعدوں کو عملی منصوبوں میں تبدیل کر دے، اپوزیشن تعمیری کردار ادا کرے اور وفاقی و ریاستی ادارے باہمی تعاون سے کام کریں تو آزاد کشمیر کو ایک مضبوط، خوش حال اور ترقی یافتہ خطے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔بیرسٹر افتخار علی گیلانی کی حلف برداری صرف ایک نئے وزیرِ اعظم کی تقرری نہیں بلکہ آزاد کشمیر کے سیاسی اور انتظامی مستقبل کے ایک نئے باب کا آغاز بھی ہے۔

مکہ جوائنٹ ڈیفنس ایگریمنٹ

مائرہ جاوید

(مصنفہ ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلیکیشنز میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہی ہیں اور اس سے قبل گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے تعلیم حاصل کر چکی ہیں۔)

28 فروری 2026 کو امریکہ اور ایران کے درمیان جنگ کے آغاز کے بعد سے دنیا مسلسل بے یقینی اور بحران کی کیفیت سے دوچار ہے۔ ابتدا میں ایسا محسوس ہوا کہ یہ بھی ایک عارضی تنازع ہے اور امریکہ کی دیگر فوجی مہمات کی طرح جلد ختم ہو جائے گا، جہاں امریکہ جنگ چھیڑنے کے بعد ملک کو لوٹ کھسوٹ کر اور تباہی کے آثار چھوڑ کر واپس چلا جاتا ہے۔ ایران سے پہلے امریکہ نے وینزویلا کے صدر کو اغوا کیا۔ اس کارروائی کا واحد مقصد وینزویلا کو ایسے معاہدوں پر دستخط کرنے پر مجبور کرنا تھا جن کے ذریعے امریکی ارب پتیوں اور تیل کمپنیوں کو وینزویلا میں تیل کی پروسیسنگ کا کاروبار جاری رکھنے کی اجازت مل سکے۔ یہ بنیادی طور پر ایک معاشی مفاد تھا۔ وینزویلا کے حوالے سے امریکہ کا مقصد پہلے دن سے واضح تھا: ملک میں داخل ہونا، صدر کو گرفتار کرنا، ملک کی قیادت تبدیل کرنا اور واپس چلے جانا۔

ایران پر حملے کے حوالے سے اسرائیل اور امریکہ کے عزائم مختلف تھے۔ اسرائیل خطے میں اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا تھا اور گریٹر اسرائیل کی جانب اپنے پہلے قدم کو بڑھانا چاہتا تھا۔ اسرائیل نے مشرقِ وسطیٰ کے حوالے اپنے مقاصد کو کبھی خفیہ نہیں رکھا۔ وہ پورے خطے کی سرزمین پر مکمل کنٹرول چاہتا ہے اور اپنی اس نامکمل خواہش کی تکمیل کی جانب خاموشی سے آگے بڑھ رہا ہے جسے وہ سرزمینِ موعود (Promised Land) کے حصول سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ بھی کوئی راز نہیں کہ اسرائیل امریکی لابیسٹوں کا سب سے بڑا سرپرست ہے اور وہاں اس کا گہرا اثر و رسوخ ہے۔ صدر ٹرمپ کے دور میں یہ اثر و رسوخ مزید بڑھ گیا، جس کی ایک وجہ ان کے داماد جیرڈ کشنر بھی ہیں۔ وہ سعودی عرب میں اہم تقریبات، میں موجود نظر آتے ہیں

چاھے وہ ولی عہد محمد بن سلمان (MBS) سے ملاقات ہو، متحدہ عرب امارات کے شہزادے سے ملاقات ہو، نیوم کے منصوبے کا افتتاح، یا پاکستان میں ہونے والے ایران۔امریکہ مذاکرات ہوں۔تقریباً ہر اہم موقع پر وہ ایک خاموش مبصر، بااثر شخصیت اور یہودی برادری کے نمائندے کے طور پر موجود نظر آئے ہیں۔

دوسری جانب امریکہ ایران میں حکومت کی تبدیلی (Change Regime) کا بیانیہ پیش کر رہا تھا۔صدر ٹرمپ مسلسل ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ خامنہ ای کو اقتدار سے ہٹانے اور ان کی جگہ رضا شاہ پہلوی کو لانے کی بات کرتے رہے۔یہ مقصد کسی حد تک حاصل بھی ہوا، تاہم امریکہ کو اندازہ نہیں تھا کہ اسرائیل کے کہنے پر ایران پر حملہ کر کے وہ ایک ایسی دلدل میں داخل ہو رہا ہے جس سے نکلنا آسان نہیں ہو گا۔

ایران دونوں، یعنی امریکہ اور اسرائیل کی توقعات سے کہیں زیادہ مضبوط ثابت ہوا۔درحقیقت ایران نے پوری دنیا کی توقعات سے بڑھ کر مزاحمت کی۔جنگ کے پہلے مرحلے میں اسرائیل اور ایران کی جانب سے روزانہ سیکڑوں میزائل داغے گئے۔اس کے بعد ایران نے مشرق وسطیٰ میں موجود امریکی فوجی اڈوں کو نشانہ بنایا۔یہ جنگ کا فیصلہ کن موڑ تھا، جس کے بعد جنگ کی حرکیات تبدیل ہو گئیں۔

اس صورتحال نے پورے مشرق وسطیٰ کے سکیورٹی نظام کو ہلا کر رکھ دیا۔امریکہ اپنے اتحادیوں اور خطے میں اپنے حامیوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہا۔ایران نے دبئی، ابوظہبی، فجیرہ، ام القیوین، کویت اور مسقط میں فوجی تنصیبات پر مسلسل حملے کیے۔دبئی میں مختلف بین الاقوامی کمپنیوں کے ڈیٹا سینٹرز اور ہیڈ کوارٹرز کو نقصان پہنچا اور کئی مقامات بند کر دیے گئے۔

اطلاعات کے مطابق چپ ٹیکنالوجی کی عالمی کمپنی Nvidia نے دبئی میں اپنے دفاتر عارضی طور پر بند کر دیے اور وہاں موجود ملازمین نے گھر سے کام شروع کر دیا۔دبئی، مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں گوگل کے کلاؤڈ اور سیلز آپریشنز کا ایک اہم علاقائی مرکز ہے۔گزشتہ سال دبئی کے ولی عہد شیخ حمدان بن محمد نے گوگل کے دفاتر کا دورہ کیا تھا، جہاں انہوں نے کمپنی کے جدید مصنوعی ذہانت (AI) کے منصوبوں کا جائزہ لیا تھا۔امریکہ کے سب سے بڑے بینک JPMorgan نے بھی خطے کے بعض حصوں میں اپنے ملازمین کو گھر سے کام کرنے کی ہدایت کی۔اس بینک کے ابوظہبی اور دبئی میں دفاتر ہیں، جبکہ وسیع تر خطے میں بیروت، قاہرہ، دوحہ، منامہ اور ریاض میں بھی اس کی موجودگی ہے۔

متعدد لگژری برانڈز کو بھی اپنے کاروبار بند کرنا پڑے۔بہت سے کارکنوں اور پیشہ ور افراد کو ملازمتوں سے فارغ کیا گیا۔اگرچہ اس بحران کو شاید اس کی اصل شدت سے کم ظاہر کیا گیا، لیکن ان حملوں نے متحدہ عرب امارات کے اس تاثر کو شدید نقصان پہنچایا ہے کہ وہ دنیا میں کاروبار کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ہے۔Group Chalhoub، جو پورے خطے میں Versace، Choo Jimmy اور Sephora سمیت مختلف برانڈز کے تقریباً 900 اسٹورز چلاتا ہے، نے بتایا کہ بحرین میں اس کے اسٹورز بند کر دیے گئے ہیں۔ای کامرس کی بڑی کمپنی Amazon نے ابوظہبی میں اپنی فل فلمنٹ سینٹر کی سرگرمیاں بند کر دیں اور پورے خطے میں ڈیلیوری سروسز معطل کر دیں۔لگژری

گروپس LVMH، Hermès اور Cartier کی مالک کمپنی Richemont کے حصص میں مارچ کے دوران 4 فیصد سے 7.5 فیصد تک کمی ریکارڈ کی گئی، اور ان کی قدر میں مسلسل مزید کمی کا سلسلہ جاری ہے۔

اس پورے تنازع میں سب سے بڑا دباؤ ایران کا جوہری ذخیرہ تھا۔ امریکہ کا ابتدائی مقصد ایران کے جوہری اثاثوں، خصوصاً افزودہ یورینیم، کو اپنی کامیابی کی علامت کے طور پر حاصل کرنا اور ایرانی ساحلوں سے واپس چلے جانا تھا۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ بارہا کہتے رہے کہ ''ایران کو جوہری ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔'' تاہم ایران سے افزودہ یورینیم حاصل کرنے کا بیانیہ پسِ پشت چلا گیا اور اس کی جگہ آبنائے ہرمز کا نیا بحران سامنے آ گیا۔ ایران کو آبنائے ہرمز کی صورت میں ایک نیا دباؤ ڈالنے کا حربہ حاصل ہو گیا۔ یہ سعودی عرب اور عرب ممالک کے تیل کو عالمی منڈیوں تک پہنچانے والا ایک اہم بحری راستہ اور اسٹریٹجک چوک پوائنٹ ہے، جہاں سے دنیا کی تقریباً 20 سے 25 فیصد، یعنی تقریباً پانچواں حصہ، تیل کی رسد گزرتی ہے۔ جنگ سے قبل تقریباً 20 ملین بیرل تیل روزانہ اس راستے سے منتقل ہوتا تھا۔

ایران کی جانب سے بار بار آبنائے ہرمز کو بند کرنے اور وہاں سے گزرنے والے بحری جہازوں کو تباہ کرنے کی دھمکیوں نے امریکہ اور صدر ڈونلڈ ٹرمپ کو شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ صدر ٹرمپ کی سوشل میڈیا پوسٹس بھی اس کیفیت کی عکاسی کرتی تھیں۔ انہوں نے سوشل میڈیا پر سخت اور برہم انداز میں الٹی میٹم جاری کرتے ہوئے ایران سے مطالبہ کیا کہ وہ آبنائے ہرمز کو مکمل طور پر دوبارہ کھولے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر تیل کی یہ اہم گزرگاہ بند رہی تو ایران کے بجلی گھروں اور بنیادی ڈھانچے کو تباہ کر دیا جائے گا، جبکہ انہوں نے تہران کے ساتھ ساتھ

تعاون نہ کرنے والے اتحادیوں کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ امریکہ کی اس بے چینی کی ایک بڑی وجہ تیل کی قیمتوں اور عالمی اسٹاک مارکیٹوں میں مسلسل اتار چڑھاؤ تھا۔ ایران کے ساتھ تنازع کے دوران عالمی بینچ مارک برینٹ خام تیل کی قیمت تقریباً 126 ڈالر فی بیرل تک پہنچ گئی، جبکہ امریکی بینچ مارک ویسٹ ٹیکساس انٹرمیڈیٹ (WTI) اور ریٹیل پٹرول کی قیمتوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔ امریکی خام تیل کی قیمت شدید بندش کے اعلانات کے دوران 104 ڈالر فی بیرل سے تجاوز کر گئی، جبکہ ریٹیل پٹرول کی اوسط قیمت 58.3 ڈالر فی گیلن سے بڑھ کر بعض علاقوں میں 4 سے 5 ڈالر سے بھی زیادہ ہو گئی۔

اس صورتحال کے نتیجے میں دنیا بھر میں مہنگائی میں اضافہ ہوا اور عام لوگوں کے لیے روزمرہ اخراجات پورے کرنا مزید مشکل ہو گیا۔ اس کا امریکہ میں صدر ٹرمپ کو شدید عوامی ردعمل کا سامنا کرنا پڑا، جس کے نتیجے میں ان کی مقبولیت اور ووٹ بینک میں کمی واقع ہوئی۔ سعودی تیل کی برآمد کے لیے دوسرا اہم بحری راستہ باب المندب ہے۔ ایران نے یمن میں اپنے حوثی اتحادیوں کے ذریعے اس راستے کو بھی متاثر کیا۔ 22 جولائی 2026 کو انہوں نے اس راستے سے گزرنے والے سعودی بحری جہازوں کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ اس اقدام نے سعودی عرب کو شدید دباؤ میں ڈال دیا۔ ایران نے 28 فروری کو سعودی عرب پر جوابی میزائل داغے، جس کے بعد مارچ میں بھی حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اپریل سے جون تک کوئی بڑا حملہ نہیں ہوا، تاہم سرحد پار ڈرون سرگرمیاں اور محدود نوعیت کی جھڑپیں جاری رہیں۔ اگست میں ایران سے وابستہ حوثی فورسز نے جازان میں سعودی آرامکو کی ریفائنری کو ڈرون حملے کا نشانہ بنانے کا دعویٰ کیا، جبکہ سعودی حکام کے مطابق حملے کے نتیجے میں معمولی آگ لگی اور کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ یہ صورتحال سعودی عرب کے لیے فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔ یہ بات واضح ہوتی گئی کہ امریکہ اپنے سعودی اتحادیوں یا مشرقِ وسطیٰ میں اپنے کسی بھی دوسرے اتحادی اور شراکت دار کو مکمل تحفظ فراہم کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔

اسی پس منظر میں سعودی عرب، ترکیہ اور پاکستان کے درمیان سہ فریقی مکہ جوائنٹ ڈیفنس ایگریمنٹ وجود میں آیا۔ معاہدے کی بنیادی شق کے مطابق کسی ایک رکن ملک پر حملہ تینوں ممالک پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ بارہا واضح کیا گیا ہے کہ یہ معاہدہ دفاعی نوعیت کا ہے۔ یہ معاہدہ 7 اگست 2026 کو طے پایا اور ایک دستخط کے ساتھ تاریخ رقم ہو گئی۔ بہت سے حلقے اس معاہدے کو ''سنی ایکارڈ'' قرار دے رہے ہیں، تاہم یہ اس سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ یہ معاہدہ مکہ مکرمہ کے الصفا پیلس میں منعقد ہونے والی مکہ المکرّمہ سمٹ فار جوائنٹ ڈیفنس کے دوران طے پایا، جہاں سعودی عرب، ترکیہ اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے درمیان باہمی تعلقات اور مشترکہ مفادات سے متعلق متعدد امور کا جائزہ لیا گیا۔ معاہدے کا مقصد کسی بھی جارحیت کے خلاف اجتماعی دفاعی صلاحیت اور بازداریت کو مضبوط بنانا ہے۔ اس کے تحت تینوں ممالک میں سے کسی ایک پر ہونے والا کوئی بھی مسلح حملہ تینوں ممالک پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ معاہدہ تینوں ممالک کے درمیان دفاعی تعاون کے تمام شعبوں کو مزید مستحکم کرنے کی بھی گنجائش فراہم کرتا ہے۔

اس حوالے سے ایران کی وزارت خارجہ کے ترجمان اسماعیل بقائی نے کہا:

''گزشتہ دو سے تین برسوں کے واقعات کو دیکھتے ہوئے خطے کے ممالک اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سکیورٹی ایسی شے نہیں جسے جعلی سکیورٹی فراہم کرنے والوں سے خریدا جا سکے۔''

بقائی نے مزید کہا کہ ''اس بات پر تشویش کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ معاہدہ ایران کے خلاف ہوگا''، اور اس بات کو اجاگر کیا کہ ایران کے پاکستان، ترکیہ اور حتیٰ کہ سعودی عرب کے ساتھ بھی گہرے مذہبی، تاریخی اور تہذیبی تعلقات ہیں۔

یہ مؤقف مثبت سوچ، امید یا سفارتی حکمتِ عملی میں سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم، اس مؤقف سے یہ تاثر ضرور ملتا ہے کہ مسلم ممالک کے درمیان بنیادی سطح پر ایک ایسا احساس موجود ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور انہیں اس حقیقت کا ادراک ہے کہ بڑی عالمی طاقتیں قومی سلامتی کے نام پر کسی بھی وقت ان کے خلاف کارروائی کر سکتی ہیں۔ پھر معاہدے کے پسِ پردہ اصل وجہ سامنے آئی، جسے ایران کی وزارتِ خارجہ کے ترجمان اسماعیل بقائی نے بغیر کسی ابہام اور کسی مصلحت کے کھل کر بیان کیا۔ انہوں نے کہا:

''یہ پیش رفت اس بات کی ایک اہم علامت ہے کہ خطے کے ممالک اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ وہ امریکہ اور خطے سے باہر کے بعض دیگر فریقوں کی جانب سے فراہم کردہ سکیورٹی کی یقین دہانی پر انحصار اور اعتماد نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے طریقے کو آزمانے کی کوشش کر رہے ہیں، جس میں اپنی صلاحیتوں اور اپنے نقطۂ نظر پر انحصار شامل ہے۔ کوئی بھی ایسا منصوبہ جو خطے کی جغرافیائی اور تاریخی حقیقتوں پر مبنی ہو، جامع اور سب کو شامل کرنے والا ہو، اور دشمن اور خطرے کی درست نشاندہی کرے، خطے میں سکیورٹی کو مضبوط بنانے، عدم استحکام کو روکنے اور صہیونی دشمن اور اس کے اتحادیوں کی جانب سے ہونے والی زیادتیوں کا سدباب کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔''

انہوں نے یہاں اسرائیل کی جانب واضح اشارہ کیا۔

نائب وزیرِ اعظم اور وزیرِ خارجہ اسحاق ڈار نے کہا کہ مکہ جوائنٹ ڈیفنس ایگریمنٹ خطے کے ہر اس ملک کے لیے ''کھلا ہے'' جو اس کے بنیادی اصولوں کی پاسداری کے لیے تیار ہو۔ یہ بیان ترک وزیرِ خارجہ کی جانب سے مصر کے ممکنہ طور پر اس معاہدے میں شامل ہونے کے عندیے کے بعد سامنے آیا۔ اسحاق ڈار نے کہا کہ یہ معاہدہ ''کئی برسوں پر محیط مذاکرات اور باہمی رابطہ کاری کا نتیجہ'' ہے اور اس کی نوعیت ''خالصتاً دفاعی'' ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ ''یہ کسی ملک کے خلاف نہیں ہے اور اس کا واحد مقصد وسیع تر خطے میں امن، استحکام اور خوشحالی کے لیے ہماری جاری کوششوں کو مزید مضبوط بنانا ہے۔''

نائب وزیرِ اعظم نے مزید وضاحت کی کہ یہ معاہدہ دستخط کرنے والے ممالک کے درمیان پہلے سے موجود کسی دوطرفہ یا کثیر الجہتی معاہدے کو منسوخ یا تبدیل نہیں کرتا، اور نہ ہی دیگر ممالک یا تنظیموں کے ساتھ موجود معاہدوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس معاہدے کی اہمیت اس پہلو

سے بھی نمایاں ہوتی ہے کہ اس پر دستخط کے بعد نائب وزیر اعظم اسحاق ڈار نے متعدد اہم بین الاقوامی رابطے کیے اور مختلف ممالک کے اعلیٰ حکام نے بھی ان سے رابطہ کیا۔

نائب وزیر اعظم نے اپنے ایرانی ہم منصب عباس عراقچی اور کویت کے وزیر خارجہ سے بات چیت کی۔ انہوں نے جمہوری جمہوریہ کانگو (DRC) کے صدر فیلکس آنتوان تشیسکیدی اور گنی بساؤ کے سابق صدر جنرل عمرو سیسوکو ایمبالو کے ساتھ بھی معاہدے کے خدوخال پر تبادلہ خیال کیا۔ نائب وزیر اعظم اسحاق ڈار نے کینیڈا کی وزیر خارجہ انیتا آنند سے بھی گفتگو کی۔ یہ تمام روابط اس سلسلے کی کڑیاں ہیں جو آنے والے کل کی وسیع تر علاقائی حقیقت کا تعین کرنے جا رہی ہیں۔ اب یہ مسلم امہ کے رہنماؤں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ممالک اور عوام کو کس طرح محفوظ رکھتے ہیں اور ان اتحادوں کو کس طرح مؤثر بناتے ہیں۔

ان تمام پیش رفتوں سے ایک بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ پاکستان ایک اہم علاقائی طاقت اور کھلاڑی ہے، اور آج یا آنے والے کل کی عالمی سیاست میں پاکستان کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستان زندہ باد!

کیا نئے صوبوں کا قیام پاکستان کے مسائل کا حل ہے؟

ڈاکٹر محمد گلزار
(ایسوسی ایٹ پروفیسر و ڈائریکٹر اسکول آف کامرس اینڈ اکاؤنٹنسی یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی (UMT)، لاہور)

پاکستان کی سیاست میں نئے صوبوں کے قیام کی بحث ایک ایسے ڈرامے کی مانند ہے جو ہر چند سال بعد ایک نئے منظر، نئے نعرے اور نئے سیاسی کرداروں کے ساتھ قومی منظرنامے پر نمودار ہوتا ہے۔ جب ملک معاشی بحران، انتظامی کمزوری، سیاسی بے یقینی یا علاقائی محرومی کا شکار ہوتا ہے تو "نئے صوبوں" کا مطالبہ دوبارہ زور پکڑ لیتا ہے۔ جنوبی پنجاب، بہاولپور، ہزارہ، کراچی اور دیگر علاقوں سے مختلف اوقات میں ایسی آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں۔

لیکن اصل سوال یہ نہیں کہ پاکستان میں نئے صوبے بننے چاہییں یا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا نئے صوبوں کا قیام پاکستان کے بنیادی مسائل کا حل فراہم کرسکتا ہے؟ کیا نقشے پر نئی حد بندی سے غربت کم ہوگی، روزگار بڑھے گا، اسکول اور اسپتال بہتر ہوں گے، سرمایہ کاری آئے گی اور عام شہری کو انصاف آسانی سے ملے گا؟ یا پھر نئے صوبے صرف نئی اسمبلیوں، نئی وزارتوں، نئے سیکریٹریٹس اور نئی سیاسی اشرافیہ کو جنم دیں گے؟

یہ سوال اس لیے بھی اہم ہے کہ پاکستان اب تقریباً 24 کروڑ سے زیادہ آبادی کا ملک ہے۔ 2023 کی مردم شماری کے مطابق ملک کی آبادی تقریباً 241.5 ملین ہو چکی ہے۔ پنجاب کی آبادی تقریباً 127.7 ملین، سندھ 55.7 ملین، خیبر پختونخوا تقریباً 40.9 ملین اور

بلوچستان تقریباً 14.9 ملین ہے۔ اس غیر متوازن آبادی اور وسیع جغرافیے کے تناظر میں موجودہ چار صوبوں کا انتظامی ڈھانچہ یقیناً سنجیدہ غور کا تقاضا کرتا ہے۔

لہٰذا نئے صوبوں کی بحث کو نہ محض سیاسی نعرہ سمجھنا چاہیے اور نہ اسے پاکستان کے تمام مسائل کا جادوئی علاج تصور کرنا چاہیے۔ اس مسئلے کو انتظامی ضرورت، معاشی استعداد، آئینی تقاضوں، سیاسی طاقت، قومی یکجہتی اور مقامی حکومت کے وسیع تر تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔

پاکستان کے چار صوبے: کیا موجودہ ڈھانچہ کافی ہے؟

پاکستان کا موجودہ وفاقی ڈھانچہ تاریخی، سیاسی اور آئینی عوامل کا نتیجہ ہے۔ لیکن آبادی، شہری آبادی، معاشی سرگرمی اور انتظامی ضروریات میں گزشتہ چند دہائیوں کے دوران نمایاں تبدیلی آئی ہے۔

پنجاب اس بحث کی سب سے واضح مثال ہے۔ تقریباً 128 ملین آبادی رکھنے والا ایک صوبہ کئی ممالک سے زیادہ آبادی رکھتا ہے۔ ایک ہی صوبائی دارالحکومت لاہور سے اتنے بڑے اور متنوع علاقے کے لیے پالیسی سازی، بجٹ سازی، ترقیاتی منصوبہ بندی اور انتظامی نگرانی ایک غیر معمولی چیلنج ہے۔

جنوبی پنجاب کے دور دراز اضلاع، مثلاً راجن پور، ڈیرہ غازی خان، رحیم یار خان اور بہاولنگر، کے مسائل لاہور سے مختلف نوعیت کے ہیں۔ اسی طرح سندھ میں کراچی کے شہری مسائل اندرونِ سندھ کے زرعی، دیہی اور بنیادی سہولیات کے مسائل سے بہت مختلف ہیں۔ خیبر پختونخوا میں پشاور، ہزارہ، جنوبی اضلاع اور سابق قبائلی اضلاع کی انتظامی ضروریات بھی ایک جیسی نہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں نئے صوبوں کے حامیوں کا بنیادی استدلال مضبوط دکھائی دیتا ہے: حکومت جتنی شہری کے قریب ہوگی، اتنا ہی مؤثر انتظام ممکن ہوگا۔

حامیوں کی دلیل: چھوٹی انتظامی اکائیاں، بہتر حکمرانی

نئے صوبوں کے حامیوں کے مطابق پاکستان میں انتظامی اکائیوں کی تعداد اور حجم کو جدید تقاضوں کے مطابق ازسرِنو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بہت بڑے صوبوں میں طاقت اور وسائل چند بڑے شہروں اور صوبائی سیکریٹریٹس میں مرتکز ہو جاتے ہیں۔

اگر کسی شہری کو اپنے جائز انتظامی، عدالتی یا سرکاری کام کے لیے سینکڑوں کلومیٹر سفر کرنا پڑے تو حکومت اس کے لیے ایک دور افتادہ ادارہ بن جاتی ہے۔ وقت، سفری اخراجات اور قانونی و انتظامی پیچیدگیاں عام شہری کو اپنے حق سے دستبردار ہونے پر مجبور کر سکتی ہیں۔

ایک چھوٹا صوبہ اس لحاظ سے فائدہ مند ہو سکتا ہے کہ اس کا دارالحکومت نسبتاً کم فاصلے پر ہو، صوبائی بیوروکریسی مقامی مسائل سے زیادہ واقف ہو اور ترقیاتی ترجیحات مقامی ضروریات کے مطابق طے کی جا سکیں۔

یہی منطق جنوبی پنجاب اور ہزارہ کے مطالبات کے پیچھے بھی موجود ہے۔ ان علاقوں کے حامی یہ مؤقف رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے وسائل، ترقیاتی ترجیحات اور انتظامی فیصلوں پر زیادہ براہِ راست اختیار ملنا چاہیے۔

کیا نیا صوبہ محرومی ختم کردے گا؟

یہاں بحث کا دوسرا پہلو سامنے آتا ہے۔ کسی علاقے کی محرومی کا مطلب لازماً یہ نہیں کہ وہاں نیا صوبہ قائم کردیا جائے۔

محرومی کی وجوہات متعدد ہو سکتی ہیں: کمزور سیاسی نمائندگی، وسائل کی غلط ترجیح، ناقص منصوبہ بندی، کمزور مقامی حکومت، بیوروکریسی کی مرکزیت، کمزور ٹیکس نظام، سیاسی مداخلت اور احتساب کی کمی۔

اگر اصل مسئلہ "مرکزیت" ہے تو ممکن ہے کہ نیا صوبہ بنانے کے بجائے موجودہ صوبے کے اندر اختیارات کو اضلاع اور مقامی حکومتوں تک منتقل کرنا زیادہ مؤثر حل ہو۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے:

کیا ہم بڑے صوبے کو چھوٹا کر کے ایک نیا چھوٹا صوبہ بنائیں گے، یا پھر طاقت کو واقعی عوام تک منتقل کریں گے؟

اگر جنوبی پنجاب صوبہ بن بھی جائے لیکن تمام اختیارات ملتان یا کسی دوسرے نئے دارالحکومت میں مرتکز ہو جائیں تو چند سال بعد بہاولپور، ڈیرہ غازی خان یا رحیم یار خان کے شہری بھی وہی شکایت کر سکتے ہیں جو آج لاہور کے بارے میں کی جاتی ہے۔

اصل مسئلہ: صوبے نہیں، اختیارات کی مرکزیت؟

پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس (PIDE)

کی تحقیق نے بھی پاکستان میں وفاق سے صوبوں اور صوبوں سے مقامی حکومتوں تک اختیارات کی منتقلی کے مسئلے کو نمایاں کیا ہے۔

18ویں آئینی ترمیم نے وفاق سے صوبوں کو اہم اختیارات منتقل کیے، لیکن صوبوں سے مقامی حکومتوں تک حقیقی سیاسی، انتظامی اور مالیاتی اختیار کی منتقلی اب بھی نامکمل ہے۔

یہی پاکستان کے مسئلے کی شاید سب سے اہم جہت ہے۔

پاکستان کا مسئلہ صرف یہ نہیں کہ صوبے بڑے ہیں؛ مسئلہ یہ بھی ہے کہ اختیارات چند مراکز میں مرتکز ہیں۔

آئین کا آرٹیکل 140-A واضح طور پر صوبوں کو پابند کرتا ہے کہ وہ مقامی حکومت کا نظام قائم کریں اور سیاسی، انتظامی اور مالی ذمہ داریاں منتخب مقامی نمائندوں کو منتقل کریں۔ اگر اس آئینی اصول کو اس کی حقیقی روح کے مطابق نافذ کیا جائے تو بہت سے مسائل صوبہ تقسیم کیے بغیر بھی حل کیے جا سکتے ہیں۔

نئے صوبے کا معاشی فائدہ: حقیقت یا مفروضہ؟

نئے صوبوں کے حامیوں کی ایک اہم دلیل یہ ہے کہ نئی انتظامی اکائیاں اپنے وسائل کو زیادہ مؤثر طریقے سے استعمال کر سکتی ہیں۔ مثلاً جنوبی پنجاب میں زراعت، لائیو اسٹاک، ٹیکسٹائل، خوراک، آم، کپاس اور دیگر زرعی و صنعتی شعبوں میں نمایاں معاشی امکانات موجود ہیں۔ اسی طرح ہزارہ میں سیاحت، ہائیڈرو پاور اور قدرتی وسائل کے مواقع ہیں۔ اندرون سندھ میں زراعت، معدنیات اور صنعتی سرگرمیوں کے مختلف امکانات موجود ہیں۔

اگر ایک خطے کو اپنی معاشی پالیسی، سرمایہ کاری کے فروغ، انفراسٹرکچر اور انسانی وسائل پر زیادہ اختیار ملے تو وہ معیشت کو زیادہ مؤثر انداز میں ترقی دے سکتا ہے۔

لیکن یہاں ایک اہم شرط ہے: صوبے کا قیام معاشی خودکفالت کی ضمانت نہیں۔

نیا صوبہ اگر اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے مسلسل وفاقی منتقلی پر انحصار کرے، اپنا ٹیکس بیس نہ بڑھا سکے، صنعت نہ لا سکے اور غیر ترقیاتی اخراجات میں اضافہ کرتا جائے تو نیا صوبہ ترقی کا انجن بننے کے بجائے قومی خزانے پر مزید بوجھ بن سکتا ہے۔

مالیاتی وفاقیت: اصل سوال پیسہ کہاں سے آئے گا؟

نئے صوبوں کی بحث دراصل بڑی حد تک مالیاتی وفاقیت کی بحث بھی ہے۔

وفاق اور صوبائی حکومتوں کے درمیان وسائل کی تقسیم قومی مالیاتی کمیشن (NFC) کے ذریعے ہوتی ہے۔ اگر نئے صوبے بنائے جاتے ہیں تو یہ سوال لازماً اٹھے گا کہ ان کے مالی حصے کا تعین کس فارمولے کے تحت ہوگا؟ کیا موجودہ صوبوں کا حصہ کم ہوگا یا وفاقی وسائل میں اضافہ کیا جائے گا؟ نئی انتظامی مشینری کے اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے؟

عالمی بینک نے بھی پاکستان کے مالیاتی وفاقیت کے مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ وفاق، صوبوں اور مقامی حکومتوں کے درمیان مالی وسائل اور ذمہ داریوں کی تقسیم کو زیادہ مؤثر بنانا ضروری ہے۔

اس لیے نئے صوبوں پر بحث کرتے وقت صرف یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ "کتنا علاقہ ملے گا؟" بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کتنا ریونیو پیدا ہوگا، کتنے اخراجات ہوں گے اور عوام کو فی روپیہ کتنی بہتر خدمت ملے گی؟

نئے صوبے: ایک نیا سیاسی طبقہ؟

مخالفین کا سب سے مضبوط معاشی اعتراض یہ ہے کہ نیا صوبہ نئی حکومت کا مطلب بھی ہے۔

ایک نئے صوبے کے لیے نئی اسمبلی، گورنر، وزیر اعلیٰ، کابینہ، صوبائی سیکرٹریٹ، پولیس کا اعلیٰ ڈھانچہ، مختلف محکموں کے سیکریٹری، دفاتر، سرکاری رہائش گاہیں اور دیگر ادارے درکار ہوں گے۔

پاکستان پہلے ہی مالی دباؤ، قرضوں، بلند حکومتی اخراجات اور محدود مالی گنجائش کا سامنا کر رہا ہے۔ ایسے میں اگر نئے صوبوں کی تشکیل کا بنیادی نتیجہ سرکاری اداروں اور سیاسی عہدوں کی تعداد میں اضافہ ہو تو یہ اصلاحات کے بجائے انتظامی توسیع بن سکتی ہے۔

یہ سوال بالکل جائز ہے کہ اگر ایک نیا صوبہ سالانہ اربوں روپے اضافی انتظامی اخراجات پیدا کرے تو کیا اس کے نتیجے میں عوام کو اتنی ہی اضافی معاشی اور سماجی قدر بھی حاصل ہوگی؟

لہٰذا ہر مجوزہ صوبے کے لیے Cost-Benefit Analysis لازمی ہونا چاہیے۔

قومی یکجہتی یا نئی لسانی تقسیم؟

نئے صوبوں کی بحث کا سب سے حساس پہلو شناخت اور قومیت ہے۔

اگر نئے صوبے انتظامی سہولت، معاشی استعداد اور جغرافیائی ضرورت کی بنیاد پر بنائے جائیں تو یہ ایک انتظامی اصلاح ہو سکتی ہے۔

لیکن اگر صوبوں کی تشکیل لسانی یا نسلی بنیادوں پر ہو تو خطرات بڑھ سکتے ہیں۔

سندھ میں کراچی کی علیحدہ انتظامی حیثیت، خیبر پختونخوا میں ہزارہ، پنجاب میں جنوبی پنجاب اور بہاولپور، یا بلوچستان میں مختلف

علاقائی شناختوں کے مطالبات اس بات کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ پاکستان میں جغرافیہ اور شناخت ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔

اس لیے نئے صوبوں کے قیام کے لیے ایک بنیادی اصول ہونا چاہیے:

صوبہ شناخت کو ختم کرنے کے لیے نہیں، حکمرانی بہتر بنانے کے لیے بنایا جائے۔

اگر انتظامی تقسیم نئی لسانی دیواریں پیدا کرنے لگے تو اس کا فائدہ محدود اور نقصان وسیع ہو سکتا ہے۔

پانی، گیس اور بجلی: ایک پیچیدہ مسئلہ

پاکستان میں صوبائی تقسیم کا معاملہ صرف سیاسی نمائندگی تک محدود نہیں۔ پانی، گیس، بجلی، معدنی وسائل اور قدرتی وسائل کی تقسیم بھی اس کا حصہ بن جائے گی۔

آج چار صوبوں کے درمیان پانی کی تقسیم اور وسائل کی ملکیت پر اختلافات موجود ہیں۔ اگر صوبوں کی تعداد آٹھ یا دس ہو جائے تو مشترکہ وسائل کی تقسیم مزید پیچیدہ ہو سکتی ہے۔

مثلاً ایک نئے صوبے کو دریا کے پانی میں کتنا حصہ ملے گا؟ گیس پیدا کرنے والے علاقے کی رائلٹی کس سطح پر جائے گی؟ بجلی پیدا کرنے والے خطے کو کیا مالی فائدہ ملے گا؟ معدنیات کے حقوق وفاق، صوبے اور مقامی حکومت کے درمیان کس طرح تقسیم ہوں گے؟

لہٰذا نئے صوبوں کا نقشہ بنانے سے پہلے وسائل کی تقسیم کا نیا وفاقی معاہدہ بھی ضروری ہوگا۔

آئینی حقیقت: صوبہ بنانا اتنا آسان نہیں

پاکستان کے آئین میں صوبے کی حدود تبدیل کرنا یا نیا صوبہ بنانا ایک پیچیدہ آئینی عمل ہے۔ آرٹیکل 239 کے تحت آئینی ترمیم کے لیے پارلیمان میں دو تہائی اکثریت درکار ہوتی ہے، جبکہ کسی صوبے کی حدود تبدیل کرنے سے متعلق ترمیم کے لیے متعلقہ صوبائی اسمبلی کی بھی دو تہائی اکثریت ضروری ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ کوئی وفاقی حکومت اپنی سیاسی خواہش سے اکیلے نیا صوبہ قائم نہیں کر سکتی۔

یہ آئینی رکاوٹ دراصل ایک حفاظتی نظام بھی ہے۔ صوبوں کی سرحدیں کسی عارضی سیاسی اکثریت، انتخابی مفاد یا وقتی سیاسی دباؤ کی بنیاد پر تبدیل نہیں ہونی چاہییں۔

نئے صوبے کا قیام قومی اتفاقِ رائے، آئینی طریقہ کار اور متعلقہ عوام کی حقیقی رضامندی کے بعد ہی ہونا چاہیے۔

دنیا ہمیں کیا سکھاتی ہے؟

پاکستان کے حامی اکثر بھارت، نائجیریا، جرمنی، امریکہ یا دیگر وفاقی ممالک کی مثالیں دیتے ہیں کہ وہاں زیادہ ریاستیں یا صوبے موجود ہیں۔

یہ مثالیں ایک اہم سبق ضرور دیتی ہیں: بڑی ریاست کو چھوٹی انتظامی اکائیوں میں تقسیم کرنا بذاتِ خود غلط نہیں۔

بھارت نے وقت کے ساتھ اپنی ریاستوں کی حدود تبدیل کیں اور نئی ریاستیں بنائیں۔ بعض صورتوں میں اس سے انتظامی سہولت اور علاقائی نمائندگی میں اضافہ ہوا۔ لیکن وہاں بھی ریاستوں کی کامیابی کا انحصار صرف ان کے سائز پر نہیں بلکہ اداروں، مالیاتی نظام، مقامی حکومت، معاشی سرگرمی اور سیاسی انتظام پر ہے۔

اس لیے پاکستان کو کسی دوسرے ملک کا ماڈل لفظ بہ لفظ نقل کرنے کے بجائے اپنے حالات کے مطابق ماڈل تیار کرنا ہوگا۔

نئے صوبے یا بااختیار بلدیاتی نظام؟

یہاں شاید پاکستان کے لیے سب سے اہم پالیسی انتخاب سامنے آتا ہے۔

اگر مقصد صرف عوام کو حکومت کے قریب لانا ہے تو نئے صوبے واحد راستہ نہیں۔ مضبوط، بااختیار اور مالی طور پر خودمختار مقامی حکومتیں بھی یہی مقصد حاصل کر سکتی ہیں۔

ایک منتخب میئر یا ضلعی حکومت اگر اپنے علاقے کے پانی، صفائی، سڑکوں، بنیادی صحت، مقامی ٹرانسپورٹ، شہری منصوبہ بندی اور دیگر بنیادی مسائل کے لیے فیصلہ سازی اور بجٹ رکھتی ہو تو شہری کو ہر معاملے کے لیے صوبائی دارالحکومت کا رخ نہیں کرنا پڑے گا۔

ایک بہتر راستہ: پہلے اصلاحات، پھر نئی حد بندی

پاکستان کے لیے ایک قابلِ عمل حکمت عملی تین مراحل پر مشتمل ہو سکتی ہے۔

پہلا مرحلہ: حقیقی بلدیاتی اختیار۔ آرٹیکل 140-A کے مطابق مقامی حکومتوں کو سیاسی، انتظامی اور مالی اختیارات دیے جائیں۔ صوبائی فنانس کمیشن کو فعال کیا جائے اور صوبائی وسائل کا ایک متعین حصہ اضلاع اور مقامی حکومتوں کو براہِ راست منتقل کیا جائے۔

دوسرا مرحلہ: انتظامی اکائیوں کی از سر نو جانچ۔ تمام ڈویژنز اور اضلاع کا آبادی، رقبہ، جغرافیہ، انتظامی فاصلے، معاشی صلاحیت، ٹیکس بیس، قدرتی وسائل اور عوامی رائے کی بنیاد پر جائزہ لیا جائے۔ صرف ان علاقوں میں صوبائی حیثیت پر غور کیا جائے جہاں انتظامی اور معاشی بنیاد مضبوط ہو۔

تیسرا مرحلہ: غیر جانب دار قومی کمیشن۔ سیاسی جماعتوں کی نمائندگی کے ساتھ ایک بااختیار قومی حد بندی کمیشن قائم کیا جائے جو صوبوں کی ممکنہ تعداد، حدود، دارالحکومت، مالیاتی حصے، وسائل، سول سروس اور انتظامی ڈھانچے پر جامع سفارشات دے۔

اس عمل کو انتخابی سیاست سے الگ رکھنا ضروری ہوگا۔

تو پھر کیا نئے صوبے بننے چاہییں؟

اس سوال کا دیانت دار جواب یہ ہے کہ کچھ حالات میں ہاں، لیکن ہر مسئلے کے لیے نہیں۔

اگر کوئی خطہ بہت بڑا، جغرافیائی طور پر دور افتادہ، انتظامی طور پر محروم، معاشی طور پر قابلِ عمل اور عوامی اتفاقِ رائے کا حامل ہو تو نئے صوبے کا مطالبہ سنجیدگی سے زیرِ غور آنا چاہیے۔

لیکن اگر مقصد صرف یہ ہے کہ کسی علاقے کو ترقی نہیں مل رہی، تو پہلے یہ دیکھا جائے کہ موجودہ صوبے میں اس کے وسائل، بجٹ، بلدیاتی ادارے اور انتظامی اختیارات کیوں مؤثر نہیں ہیں۔

اگر مسئلہ لاہور، کراچی یا پشاور میں اختیارات کے ارتکاز کا ہے تو ملتان، سکھر یا ایبٹ آباد میں نیا ارتکاز پیدا کرنا مکمل حل نہیں ہوگا۔

حتمی نتیجہ: نقشہ بدلنے سے زیادہ نظام بدلنے کی ضرورت

پاکستان میں نئے صوبوں کا قیام نہ کوئی جادوئی معجزہ ہے اور نہ ہی لازماً قومی تباہی کا راستہ۔ یہ صرف ایک انتظامی آلہ ہے۔ اس آلے کا نتیجہ اس بات پر منحصر ہوگا کہ اسے کس مقصد، کس اصول اور کس نظام کے تحت استعمال کیا جاتا ہے۔

اگر نئے صوبے مضبوط اداروں، شفاف مالیاتی نظام، بااختیار مقامی حکومتوں، معاشی منصوبہ بندی، واضح وسائل کی تقسیم اور جواب دہ سیاسی نظام کے ساتھ بنائے جائیں تو یہ علاقائی محرومی کم کرنے، حکمرانی کو عوام کے قریب لانے اور نئے معاشی مراکز پیدا کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

لیکن اگر نئے صوبے صرف نئی اسمبلیوں، نئے وزراء، نئے گورنر ہاؤسز، نئی بیوروکریسی اور نئی سیاسی اشرافیہ پیدا کرنے کے لیے بنائے گئے تو پاکستان کے بنیادی مسائل حل ہونے کے بجائے سرکاری اخراجات اور سیاسی تنازعات میں اضافہ ہوگا۔

اس لیے پاکستان کے لیے شاید سب سے اہم سوال یہ نہیں کہ "کتنے صوبے ہونے چاہییں؟" بلکہ یہ ہے کہ:

"ہر پاکستانی شہری تک اچھی حکومت، انصاف، تعلیم، صحت، روزگار اور بنیادی سہولیات کتنی جلدی، کتنی کم لاگت اور کتنی جواب دہی کے ساتھ پہنچ سکتی ہیں؟"

اگر نئے صوبے اس سوال کا بہتر جواب فراہم کرتے ہیں تو ان کا قیام ایک سنجیدہ قومی اصلاح بن سکتا ہے۔ اگر مضبوط بلدیاتی حکومتیں، انتظامی اصلاحات، ڈیجیٹل گورننس اور مالیاتی اختیارات کی منتقلی یہی مقصد کم لاگت اور زیادہ مؤثر انداز میں حاصل کر سکتی ہے تو پہلے ان اصلاحات کو آزمانا زیادہ دانشمندانہ ہوگا۔

آخرکار پاکستان کا مسئلہ صرف نقشے کا مسئلہ نہیں، حکمرانی کا مسئلہ ہے۔ نئے صوبے نقشے کی لکیریں بدل سکتے ہیں؛ لیکن مضبوط ادارے، بااختیار مقامی حکومتیں، شفاف مالیات اور جواب دہ قیادت ہی عوام کی زندگی بدل سکتی ہے۔

اور شاید یہی اس پوری بحث کا سب سے متوازن نتیجہ ہے:

پاکستان کو صرف نئے صوبوں کی نہیں، بہتر صوبوں، مضبوط مقامی حکومتوں اور بہتر حکمرانی کی ضرورت ہے۔

امریکہ ایران جنگ اور آبنائے ہرمز کا تنازعہ

ناصر نقوی
(مصنف سینئر جرنلسٹ اور کالم نویس ہیں)

دنیا میں اس بات کی بے چینی ہے کہ امریکہ، ایران جنگ کا خاتمہ کیسے ہوگا؟ کیا آبنائے ہرمز کے تنازعے کا کوئی حل بھی نکلے گا یا یہ بھی فلسطین اور کشمیر کی طرح ایک ایسا مسئلہ بن جائے گا جس کا برسوں میں کوئی حل نہیں نکل سکے گا؟ یہی نہیں، مشرقِ وسطیٰ میں بسنے والے اور تیل کی قدرتی دولت سے ''موج مستی'' کرنے والے بھی افراتفری کا شکار ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس کی وجوہات امریکی صدر اور سینٹ حکام کی حکمتِ عملی کو قرار دیا جا رہا ہے۔

پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت نے عالمی امن اور اسلامی ممالک کو جنگ کا ایندھن بنانے سے روکنے کے لیے تاریخی کردار ادا کیا۔ بداعتمادی کی فضا میں بھی اسلام آباد معاہدہ ایم او یو کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ وقفے وقفے سے امریکی صدر، اسرائیل اور ان کے ہمنواؤں نے ایران کی مکمل تباہی کی خبریں بھی دیں، لیکن صفِ اوّل کی ایرانی قیادت کی شہادتوں کے بعد بھی ایرانی موقف میں رتی برابر تبدیلی نہیں آئی، بلکہ ان کا موقف ''انتقام'' مزید ابھر کر سامنے آیا، اور امریکہ و اسرائیل کی مکمل بربادی تک وہ آخری جنگ لڑنے کے لیے پرعزم ہیں۔

ایرانی قیادت کا دعویٰ ہے کہ امریکہ نے جنگ مسلمانوں کے بدترین دشمن اسرائیل کے ایماء پر ناجائز الزامات لگا کر تھوپی، لہٰذا ہم نے اس کا بھرپور جواب دیا۔ موساد، را اور سی آئی اے کے ایجنٹوں نے مقامی سہولت کاروں کی مدد سے ایران اور ایرانی قوم کو نقصان پہنچایا، لیکن تمام تر نقصانات کے باوجود ایرانی قوم کے جذبۂ حریت میں کمی نہیں آئی، کیونکہ وہ نہ صرف جنگجو ہیں بلکہ صدیوں پرانی تہذیب کے وارث بھی ہیں۔

وہ صرف اللہ کو ''سپر پاور'' تسلیم کرتے ہیں۔

ان کا دعویٰ ہے کہ ہم جنگ اور مذاکرات ہر محاذ کے لیے ہر وقت تیار ہیں، لیکن دشمن مکار اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس لیے نہ اس میں جنگ کی ہمت ہے اور نہ ہی وہ مذاکرات کی میز پر جیتنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایران کا دعویٰ ہے کہ برادر پاکستان اور دیگر ممالک نے مثبت ثالثی کی، اسی لیے جنگ و جدل اور دونوں جانب کے بھاری نقصانات کے باوجود معاہدہ اسلام آباد اور سوئٹزرلینڈ میں کیا گیا، لیکن اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے امریکہ نے پھر جنگ چھیڑ دی۔

آبنائے ہرمز کی ناکہ بندی سے امریکہ فیس سیونگ کی کوشش کر رہا ہے، ورنہ اس پر مکمل ایرانی رٹ قائم ہے اور ہم اس سے کسی صورت دستبردار بھی نہیں ہوں گے۔ ہم پر ایٹمی ہتھیار بنانے کا الزام غلط ہے۔ رہبرِ معظم آیت اللہ خامنہ ای کا اس پر فتویٰ موجود ہے، لیکن ہم این پی ٹی کے رکن کی حیثیت سے محدود مقدار میں افزودہ یورینیم رکھنے کا حق رکھتے ہیں اس سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔

ان کا کہنا ہے کہ فلسطین، غزہ اور لبنان پر ایرانی موقف واضح ہے اس سے بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہم جارحانہ سوچ نہیں رکھتے، لیکن اپنی قومی سلامتی پر کسی قسم کی لچک نہیں دکھا سکتے۔ ہم زندہ قوم ہیں اور عام آدمی سے لے کر اعلیٰ قیادت تک سب کے سب جذبۂ شہادت رکھتے ہیں۔ نہ ڈرے ہیں، نہ ڈریں گے۔ ہماری کسی ہمسایہ ملک سے کوئی لڑائی نہیں، لیکن ہم اصولی طور پر انہیں دشمن کی سہولت کاری بھی نہیں کرنے دیں گے۔ جب بھی جس ملک کے اڈے ہمارے خلاف استعمال ہوئے ہم جواب ضرور دیں گے۔

جبکہ امریکہ اور اس کے اتحادی اسرائیل کا موقف مختلف ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ایران اور اس کے عزائم مشرقِ وسطیٰ کے لیے قابلِ قبول نہیں، لہٰذا اسے ہر قیمت پر سبق سکھایا جائے گا۔ دوسری جانب امریکی ایوانِ نمائندگان، سینیٹ اور عوام امریکہ، ایران جنگ کی فوری بندش کے خواہش مند ہیں، کیونکہ اس جنگ کے ردِعمل اور آبنائے ہرمز میں ایرانی سرنگوں کی بدولت دنیا بھر میں تیل کی سپلائی میں خلل پیدا ہو چکا ہے، جس کا اثر براہِ راست عالمی معیشت پر پڑ رہا ہے۔

اسی طرح اب صرف آبنائے ہرمز ہی نہیں، بلکہ ایرانی سہولت کاری میں یمن کے حوثیوں نے ''باب المندب'' جیسی دوسری اہم گزرگاہ بھی بحری جہازوں کے لیے بند کر دی ہے۔ یوں مشرقِ وسطیٰ ایک بار پھر عالمی سیاست اور معیشت کا مرکز بن چکا ہے۔ امریکہ، ایران جنگ نے امن کو خطرے میں ڈالا ہی ہے، دوسری جانب توانائی کی فراہمی، بین الاقوامی تجارت اور عالمی معیشت کو بھی بڑا جھٹکا دیا ہے۔

اس کی وجہ دنیا کی سب سے بڑی سمندری گزرگاہ آبنائے ہرمز بنی، جسے ایران نے بطور ہتھیار استعمال کیا، اور ردِعمل میں امریکہ نے اپنی طاقت دکھانے اور دباؤ بڑھانے کے لیے بحری بیڑوں سے اس کی ناکہ بندی کر دی۔ اس وقت فضائی تباہ کاریوں کے بعد جنگ کا پھیلاؤ آبنائے ہرمز میں ڈوبتا محسوس ہو رہا ہے۔ امریکہ اور اتحادی اسے کھلوانے کے لیے سفارتی اور عسکری حکمتِ عملی کے تحت متحرک ہیں۔ عمان کی

ثالثی کے بھی چرچے ہیں، لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود کوئی ایسا مستقل اور جامع معاہدہ نہیں ہو سکا جسے استحکام کی ضمانت کہا جا سکے۔

بین الاقوامی ادارے رائٹرز کے مطابق، آبنائے ہرمز ایران اور عمان کے درمیان تقریباً 33 کلومیٹر چوڑا راستہ ہے جو خلیجِ فارس کو بحیرۂ عرب سے ملاتا ہے۔ اسی راستے سے سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، کویت، عراق اور قطر سمیت دیگر ممالک اپنی گیس اور تیل کی تجارت دنیا بھر سے کرتے ہیں۔ جنگ سے پہلے عالمی سطح پر استعمال ہونے والے تقریباً 20 فیصد خام تیل اور گیس کی ترسیل اسی راستے سے ہوتی تھی۔ اسی لیے گزرگاہ کی رکاوٹ سے عالمی منڈیوں میں نہ صرف تیل اور گیس کی قیمتوں اور مہنگائی پر اثر پڑا، بلکہ معاشی بحران بھی ایک بڑی مصیبت بن گیا۔

اب یہ جنگ دو ممالک تک محدود نہیں رہی۔ اس کے اثرات مشرقِ وسطیٰ، خلیجی ممالک، اسرائیل، یمن، لبنان اور بحیرۂ احمر سے نکل کر دنیا بھر میں محسوس کیے جا رہے ہیں۔ رپورٹس کے مطابق، ایک سے زیادہ بحری جہاز حملوں کا نشانہ بنے، ہزاروں بحری کارکن مہینوں سے خطرناک حالتِ جنگ میں پھنسے ہوئے ہیں اور شپنگ انشورنس کے اخراجات میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں عالمی تجارت بحرانی کیفیت میں پھنس چکی ہے۔

اگر آج بھی مشرقِ وسطیٰ کے بحران کا تجزیہ کیا جائے تو آبنائے ہرمز کی کشیدگی مرکز میں دکھائی دے گی، کیونکہ ردِعمل میں تیل اور گیس کی

قیمتیں بڑھی ہیں، جس کی وجہ سے بجلی، ٹرانسپورٹ، صنعت، خوراک اور روزمرہ استعمال کی تمام اشیا کی لاگت بڑھ چکی ہے۔ پاکستان جیسے ترقی پذیر اور درآمدی تیل پر انحصار کرنے والے ممالک کی صورتحال زیادہ بگڑ جاتی ہے، کیونکہ بحران طویل ہونے پر صرف زرمبادلہ کے ذخائر اور مہنگائی پر اضافی دباؤ نہیں پڑتا، بلکہ درآمدی بل کے اخراجات بھی بڑھ جاتے ہیں۔

امریکی موقف ہے کہ بین الاقوامی سمندری راستے ہر صورت کھلے رہنے چاہییں، کیونکہ عالمی تجارت کسی ایک ملک کی مرضی پر منحصر نہیں ہوسکتی۔ ایران بھی یہی کہتا ہے، لیکن انداز اور سوچ مختلف ہے۔ ایرانی موقف ہے کہ جنگ سے پہلے بھی ہرمز میں تجارتی جہاز آ جا رہے تھے۔ امریکہ اور اسرائیل نے ہمیں جارحیت کا نشانہ بنایا، لہٰذا اب جب تک ہماری سلامتی، پابندیوں اور علاقائی معاملات سے متعلق خدشات دور نہیں کیے جاتے ہم ہرگز نہیں کھولیں گے۔

دونوں ممالک اپنے اپنے موقف کو جائز قرار دیتے ہیں، جبکہ مسلسل عسکری کارروائیاں مسئلے کو مزید پیچیدہ بنا رہی ہیں، بلکہ ثابت کر رہی ہیں کہ مسئلے کا حل صرف طاقت نہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عالمی امن کے لیے طاقت انتہائی اہم ہوتی ہے، لیکن دنیا گواہ ہے کہ طاقت کبھی بھی مستقل امن کی ضمانت نہیں بن سکتی۔ مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ گزشتہ دہائیوں کی ہر جنگ نے عدم استحکام کے ساتھ معاشی بحران، مہاجرین اور انسانی المیوں کو جنم دیا ہے۔

آبنائے ہرمز کو سیاسی اور جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا بھی عالمی معیشت کے لیے انتہائی خطرناک ہے، جس کا صدر ٹرمپ اور ان کے مشیروں کو اندازہ نہیں تھا۔ اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اطلاع تھی کہ جونہی ایرانی مرکزی قیادت شہید ہوگی، پورا نظام زمین بوس ہو جائے گا اور ایرانی قیادت ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہو جائے گی، لیکن نتیجہ گلے پڑ گیا۔ اب دنیا یہ سمجھ گئی ہے کہ معاملہ طاقت کے زور پر حل نہیں ہوگا۔

خلیجِ فارس میں ایک جہاز رکے تو اس کے اثرات پورے یورپ، ایشیا، افریقہ اور پاکستان جیسے ممالک تک پہنچتے ہیں۔ اس لیے یہ مسئلہ صرف امریکہ اور ایران کا نہیں، بلکہ پوری دنیا کے معاشی بحران کا ہے۔ مستقل حل کے لیے پاکستان اور برادر ممالک کو عالمی دباؤ کے لیے ہم خیال ممالک کے اشتراک سے ایسا قابلِ عمل راستہ تلاش کرنا پڑے گا جس کے ذریعے سفارت کاری اور عالمی قوانین کے احترام کے ساتھ تمام متعلقہ فریقوں کے تحفظات دور کرنے کے لیے سنجیدہ کوشش کی جاسکے۔ جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ جدید دور میں جنگیں صرف میدان تک محدود نہیں رہتیں ان کے اثرات عالمی معیشت، توانائی، تجارت اور عام شہریوں کی زندگیوں تک پہنچتے ہیں۔ تنازعہ آبنائے ہرمز اب اس کی ایک واضح اور حقیقی مثال ہے۔ اس وقت ثالثی گروپ کو مزید وسعت دینے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے، اس لیے کہ معاملات دو ممالک اور مشرقِ وسطیٰ سے نکل کر پوری دنیا کی مشکلات تک پہنچ چکے ہیں۔

بڑے سے بڑے بحران کا حل ''ڈائیلاگ'' ہی ہوتا ہے۔ پاکستان ابھی بھی ناامید نہیں۔ اس کے ایران اور امریکہ کے علاوہ تمام

دوست ممالک سے بھی رابطے ہیں۔ پسِ پردہ عمان، ایران مذاکرات بھی چل رہے ہیں، لیکن اس جنگ کا بڑا کردار اسرائیل خاموشی سے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے تحت لبنان اور غزہ میں کارروائیوں سے باز نہیں آرہا۔

امریکی حمایتیوں کا کہنا ہے کہ ایران کی پشت پناہی روس اور چین کر رہے ہیں۔ ان کی سہولت کاری نے ایران کو پسپائی سے بچایا، لیکن ایرانی قیادت کا دعویٰ ہے کہ ہم دشمن سے میزائل اور ڈرون ٹیکنالوجی میں بہت آگے ہیں۔ ہمارے حوصلے پست نہیں، مقابلہ آخری دم تک کریں گے، اس لیے کہ ہمیں مکار دشمن کا سامنا ہے۔ ہم نے اسے ناقابلِ یقین نقصان کے بعد بھی سدھرنے کے مواقع دیے، لیکن اس نے سب ضائع کر دیے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جو میدان میں کامیاب ہوتا ہے وہی مذاکرات میں سرخرو ہوتا ہے۔

ایسی صورتِ حال میں رائٹرز نے دنیا کو بتا دیا ہے کہ اگر مستقبل میں بات چیت اور سفارت کاری سے مسئلہ حل نہ کیا جا سکا تو مشرقِ وسطیٰ نہیں، پوری دنیا معاشی بحران کے لیے تیار ہو جائے۔ ایک مضبوط رائے یہی ہے کہ آج نہیں تو کل امریکہ، ایران جنگ اپنے منطقی انجام کو ضرور پہنچے گی، اور اس کی بنیاد صرف مذاکرات نہیں بلکہ روس اور عوامی جمہوریہ چین کی ضمانت بھی ہوگی۔ اس میں بھی اہم کردار پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت کا ہی ہوگا۔

لبنان، غزہ اور خطے میں امن کے بعد ترقی و خوشحالی کے ساتھ متاثرہ ممالک کی آبادکاری اور بحالی کی یقین دہانی بھی کرائی جائے گی، لیکن آبنائے ہرمز کا تنازعہ حل کیے بغیر ایسے مثبت نتائج ناممکن ہوں گے۔

پاکستان کے مختلف علاقوں میں سیکیورٹی آپریشنز اور دہشت گردی

کنول افتخار

(مصنفہ ایک ممتاز صحافی اور کالم نگار ہیں اور اخبار میں کالم لکھتی ہیں)

پاکستان کے مختلف علاقوں میں سیکیورٹی آپریشنز اور دہشت گردی کا معاملہ گزشتہ دو دہائیوں سے ملک کی سب سے بڑی داخلی سلامتی کی آزمائش رہا ہے۔ یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جو کبھی تھمتا نظر آیا، مگر مکمل طور پر کبھی ختم نہ ہوسکا۔ خیبر پختونخوا کے قبائلی اضلاع سے لے کر بلوچستان کے دور دراز پہاڑی علاقوں تک، کبھی کراچی جیسے بڑے شہر کی گلیوں تک، دہشت گردی کے واقعات اور ان کے جواب میں کیے جانے والے آپریشنز پاکستانی ریاست کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

خیبر پختونخوا، خاص طور پر قبائلی علاقے، دہشت گردی کے خلاف جنگ کا سب سے بڑا میدان رہے ہیں۔ 2007 اور 2008 کے دوران سوات میں طالبان کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ نے ریاست کو ایک فیصلہ کن کارروائی پر مجبور کیا، جس کے نتیجے میں 2009 میں آپریشن راہِ راست شروع کیا گیا۔ اس آپریشن نے سوات کو طالبان کے مکمل کنٹرول سے آزاد کرایا اور علاقے میں دوبارہ ریاستی رٹ قائم کی۔ اس کے بعد 2014 میں شمالی وزیرستان میں آپریشن ضربِ عضب کا آغاز ہوا، جو پشاور کے آرمی پبلک اسکول پر ہونے والے المناک حملے کے بعد مزید شدت اختیار کر گیا۔ اس آپریشن کے دوران شمالی وزیرستان کے وسیع علاقوں میں شدت پسندوں کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا گیا، اور بڑی تعداد میں مقامی آبادی کو عارضی طور پر نقل مکانی کرنا پڑی۔

اس کے بعد آپریشن ردالفساد شروع کیا گیا جس کا دائرہ کار پورے ملک تک وسیع کیا گیا تاکہ باقی ماندہ شدت پسند نیٹ ورکس کو ختم کیا

جا سکے۔ ان آپریشنز کے نتیجے میں کئی برسوں تک خیبر پختونخوا میں نسبتاً امن قائم رہا، مگر 2021 میں افغانستان کی صورتحال میں تبدیلی کے بعد حالات نے دوبارہ کروٹ بدلی۔ تحریک طالبان پاکستان نے دوبارہ منظم ہونا شروع کیا اور سرحد پار سے کارروائیوں میں تیزی آئی۔ نتیجتاً شمالی و جنوبی وزیرستان، باجوڑ، خیبر، اور ڈیرہ اسماعیل خان جیسے اضلاع میں سیکیورٹی فورسز کی چوکیوں پر حملے، بارودی سرنگوں کا استعمال، اور خودکش دھماکے دوبارہ معمول بننے لگے۔

حکومت نے اس بگڑتی ہوئی صورتحال کے جواب میں عزمِ استحکام کے نام سے ایک وسیع تر آپریشن اور حکمتِ عملی کا اعلان کیا، جس کا مقصد شدت پسندی کے خلاف ایک منظم اور تسلسل پر مبنی کارروائی کرنا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف اضلاع میں چھوٹے پیمانے کی انٹیلیجنس بیسڈ کارروائیاں بھی معمول کے مطابق جاری رہتی ہیں، جن میں اکثر مطلوب شدت پسندوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔

بلوچستان کی صورتحال اپنی نوعیت میں مختلف اور پیچیدہ ہے، کیونکہ یہاں مذہبی شدت پسندی کے ساتھ ساتھ نسلی و علاقائی بنیادوں پر مسلح تحریکیں بھی سرگرم ہیں۔ بلوچستان لبریشن آرمی اور اس سے منسلک دیگر تنظیموں نے حالیہ برسوں میں اپنی کارروائیوں کا دائرہ نمایاں طور پر وسیع کیا ہے۔ سیکیورٹی فورسز کے قافلوں پر حملے، ریلوے لائنوں کو نشانہ بنانا اور شاہراہوں پر مسافر بسوں کو روک کر تلاشی کے بعد ہونے والے واقعات، بلوچستان میں سیکیورٹی صورتحال کی سنگینی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگست 2024 میں مختلف اضلاع میں بیک وقت کیے گئے حملوں کی لہر نے یہ واضح کیا کہ ان مسلح تنظیموں کی منصوبہ بندی اور مربوط کارروائی کی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے۔ کوئٹہ، مستونگ، خضدار، تربت، اور پنجگور جیسے اضلاع مسلسل ان واقعات کی زد میں رہتے ہیں۔ سی پیک سے منسلک منصوبے اور ان پر کام کرنے والا عملہ بھی بارہا حملوں کا نشانہ بنایا جا چکا ہے، جس کے باعث ان منصوبوں کے لیے سیکیورٹی کے اضافی انتظامات کرنا پڑے ہیں۔ بلوچستان میں سیکیورٹی فورسز کی جانب سے وقتاً فوقتاً بڑے پیمانے کی کلیئرنس آپریشنز بھی کی جاتی رہی ہیں، جن کا مقصد پہاڑی علاقوں میں موجود عسکریت پسندوں کے ٹھکانوں کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ ان آپریشنز میں فضائی نگرانی اور زمینی دستوں کا مشترکہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کارروائیوں سے بعض علاقوں میں عارضی سکون بحال ہوتا ہے، مگر مسلح تنظیمیں اکثر اپنی حکمتِ عملی بدل کر دوبارہ سرگرم ہو جاتی ہیں، جس سے یہ سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہتا ہے۔

کراچی، جو کبھی دہشت گردی اور ٹارگٹ کلنگ کا شدید نشانہ رہا، 2013 کے بعد شروع کیے گئے کراچی آپریشن کے نتیجے میں نمایاں حد تک پرامن ہوا۔ اس آپریشن میں رینجرز اور پولیس نے مشترکہ کارروائیاں کرتے ہوئے مختلف جرائم پیشہ گروہوں اور شدت پسند نیٹ ورکس کے خلاف سخت اقدامات کیے، جس کے نتیجے میں شہر میں بھتہ خوری، ٹارگٹ کلنگ اور اغوا برائے تاوان کے واقعات میں نمایاں کمی آئی۔ تاہم حالیہ برسوں میں کراچی سمیت سندھ کے دیگر شہری علاقوں میں بھی وقتاً فوقتاً دہشت گردی کے چھوٹے مگر سنگین واقعات رپورٹ ہوتے رہے ہیں، جن میں سیکیورٹی فورسز کی تنصیبات اور غیر ملکی شہریوں کو نشانہ بنانے کی کوششیں شامل ہیں۔

پنجاب جو آبادی کے اعتبار سے ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے، نسبتاً پرامن رہا ہے، مگر یہاں بھی وقتاً فوقتاً شدت پسند نیٹ ورکس کے خلاف انٹیلیجنس بیسڈ آپریشنز کیے جاتے رہے ہیں، خاص طور پر جنوبی پنجاب کے علاقوں میں جہاں کچھ شدت پسند تنظیموں کے روابط کی نشاندہی ہوتی رہی ہے۔ کاؤنٹر ٹیررازم ڈیپارٹمنٹس ان علاقوں میں مسلسل نگرانی اور کارروائیاں کرتے رہتے ہیں تاکہ کسی بھی بڑے واقعے سے پہلے ہی شدت پسند منصوبہ بندی کو ناکام بنایا جا سکے۔ ان تمام آپریشنز کے دوران سیکیورٹی فورسز کے اہلکاروں نے بھاری جانی نقصان برداشت کیا ہے۔ فوج، پولیس، رینجرز، اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہزاروں اہلکار اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں۔ ہر آپریشن کے دوران اور اس کے بعد شہداء کے جنازے اور ان کے خاندانوں کا دکھ اس جنگ کی حقیقی قیمت کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح عام شہری بھی ان حملوں کا نشانہ بنتے رہے ہیں، خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں سیکیورٹی آپریشنز کیے جاتے ہیں، وہاں کی مقامی آبادی کو بھی نقل مکانی، کاروبار کی بندش اور روزمرہ زندگی میں شدید خلل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

سیکیورٹی آپریشنز کی نوعیت وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی رہی ہے۔ ابتدائی برسوں میں بڑے پیمانے کی زمینی کارروائیاں کی جاتی تھیں، جن میں پوری آبادی کو نقل مکانی پر مجبور کر کے علاقے کو مکمل طور پر کلیئر کیا جاتا تھا۔ حالیہ برسوں میں انٹیلیجنس بیسڈ کارروائیوں پر زیادہ انحصار کیا جا رہا ہے، جن میں مخصوص اہداف کو نشانہ بنایا جاتا ہے تاکہ عام آبادی کو کم سے کم نقصان پہنچے۔ اس کے باوجود بلوچستان اور خیبر پختونخوا کے کچھ علاقوں میں بڑے پیمانے کی کارروائیاں اب بھی وقتاً فوقتاً ضروری سمجھی جاتی ہیں، خاص طور پر جب شدت پسند تنظیمیں کسی خاص علاقے میں

مضبوط ہو جاتی ہیں۔

پاکستانی سیکیورٹی اداروں کی جانب سے وقتاً فوقتاً یہ دعوے بھی کیے جاتے ہیں کہ مختلف آپریشنز میں سینکڑوں شدت پسندوں کو ہلاک یا گرفتار کیا گیا ہے، اور مختلف علاقوں سے اسلحہ اور بارود کی بڑی مقدار برآمد کی گئی ہے۔ یہ اعداد و شمار سیکیورٹی فورسز کی مسلسل کوششوں کی نشاندہی کرتے ہیں، مگر اس کے باوجود حملوں کا سلسلہ مکمل طور پر نہیں رک سکا، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شدت پسند نیٹ ورکس اپنی صفوں کو دوبارہ منظم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مختلف علاقوں میں ہونے والے آپریشنز کی نوعیت میں فرق بھی قابلِ ذکر ہے۔

خیبر پختونخوا میں زیادہ تر کارروائیاں مذہبی بنیادوں پر منظم شدت پسند تنظیموں کے خلاف ہوتی ہیں، جبکہ بلوچستان میں سیکیورٹی فورسز کو ایک ساتھ کئی محاذوں پر علیحدگی پسند مسلح تنظیموں اور بعض مذہبی شدت پسند گروہوں دونوں کے خلاف کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ یہ دوہرا چیلنج بلوچستان کی سیکیورٹی صورتحال کو مزید پیچیدہ بنا دیتا ہے، اور اسی وجہ سے وہاں تعینات سیکیورٹی فورسز کو مختلف طرز کی حکمتِ عملیاں بیک وقت اپنانا پڑتی ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پاکستان کے مختلف علاقوں میں جاری سیکیورٹی آپریشنز اور دہشت گردی کے واقعات ایک مسلسل اور طویل معرکے کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ سیکیورٹی فورسز کی قربانیاں، مسلسل کارروائیاں، اور بدلتی ہوئی حکمتِ عملیاں اس بات کی گواہ ہیں کہ ریاست اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ تاہم شدت پسند نیٹ ورکس کی موجودگی، ان کی دوبارہ منظم ہونے کی صلاحیت، اور مختلف علاقوں میں مختلف نوعیت کے خطرات، اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ جنگ ابھی مکمل طور پر ختم ہونے سے کوسوں دور ہے، اور آنے والے وقت میں بھی سیکیورٹی آپریشنز پاکستان کی داخلی سلامتی کی پالیسی کا ایک مستقل اور اہم حصہ بنے رہیں گے۔

تجارتی دنیا میں پاکستان عالمی معیار کے لیے تیار

رباب زہرا
(مصنفہ ملکی اور بین الاقوامی امن اور احترام انسانیت کے حوالے سے مختلف اخبارات اور رسائل کے لیے لکھتی ہیں)

یہ حقیقت ہے کہ دنیا نہ صرف بدل چکی ہے بلکہ تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ اسی لیے موجودہ جدید دور کے تقاضوں کے تحت زندگی کے تمام شعبہ جات میں روزانہ کی بنیاد پر تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ جو حالات کے مطابق اپنے آپ کو تیار کر کے مقابلے کی دوڑ میں شامل ہوگا، وہی ترقی، خوشحالی اور کامیابی کا مزہ چکھے گا، باقی پیچھے رہ جائیں گے۔ لہٰذا دنیا میں تجارت اور تجارتی انداز بھی بالکل مختلف ہو چکے ہیں۔ اب اچھے، بڑے اور کامیاب کاروبار کے لیے ماضی کی طرح مہنگے دفاتر، شوروم اور بین الاقوامی ڈسٹری بیوٹرز کی ضرورت ہرگز نہیں، بلکہ ہر چھوٹا بڑا کاروبار بھی ایک لیپ ٹاپ اور انٹرنیٹ کے ذریعے گھر بیٹھے دنیا بھر کے خریداروں تک پہنچ سکتا ہے۔ کیونکہ علی بابا، ایمیزون اور دراز نے عالمی تجارت کو ایسی نئی جہت دے دی ہے کہ اب کاروبار کو کامیابی سے چلانے کے لیے ان سے بہت کچھ سیکھنا ہوگا۔

ایسے میں سوال یہ ہے کہ کیا نئے تجارتی تقاضوں اور ڈیٹا انقلاب سے پاکستان بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے یا نہیں؟ ایک اندازے کے مطابق جواب ہاں ہی ہے، کیونکہ دنیا میں زندہ رہنے اور اپنی تجارتی ساکھ میں بہتری لانے کے لیے دنیا کے ساتھ ہی چلنا پڑے گا۔ ''جو ڈر گیا، وہ مر گیا''، لیکن قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھنے کے لیے ہزاروں جتن کرنے ہوں گے۔ یقینی بات ہے کہ پاکستان ڈیجیٹل انقلاب کی خواہش اور باصلاحیت نوجوانوں کی موجودگی کے ساتھ اپنے وسائل اور مسائل میں گھرا ہوا ایک ترقی پذیر ملک ہے، جو اپنی منزل تک پہنچنے

کے سفر میں ہے۔ پھر بھی نا امیدی کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ پاکستان کی ''ای کامرس'' مارکیٹ محدود وسائل اور لامحدود مسائل کے باوجود ہر لمحے تیزی سے ترقی کر رہی ہے، جس کا ثبوت بین الاقوامی تجارتی رپورٹس ہیں۔

ان رپورٹس کے مطابق، 2025 میں پاکستان کی ای کامرس مارکیٹ کا حجم تقریباً 5.7 ارب امریکی ڈالر تک پہنچ گیا تھا، جبکہ علی بابا ڈاٹ کام سیلر سینٹر کے حوالے سے اس کی ترقی کی شرح سالانہ 10 سے 15 فیصد رہی۔ اس میں ترقی کی گنجائش ابھی بہت زیادہ موجود ہے، اس لیے کہ آن لائن تجارت ابھی بھی ملک کی مجموعی ریٹیل مارکیٹ کے صرف پانچ فیصد حصے پر مشتمل ہے۔ جبکہ اسٹیٹ بینک کے مطابق مالی سال 2025 میں پاکستان میں 111 ملین سے زائد ای کامرس ٹرانزیکشنز ریکارڈ کی گئیں، جو گزشتہ سال کے مقابلے میں تقریباً 24 فیصد زیادہ تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستانی صارفین تیزی سے ڈیجیٹل خریداری کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کاروباری اور تجارتی سرگرمی کے لیے صرف صارف کی دلچسپی کافی نہیں۔ وہ جس طرح آتے ہیں، اسی طرح واپسی کا راستہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ اس راستے کو بند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عالمی معیار کے مطابق مضبوط کاروباری نظام بھی تشکیل دیا جائے۔ اس کا ثبوت تین بڑے اداروں علی بابا، ایمیزون اور دراز نے دیا ہے۔

ان کا جائزہ لیں تو پتا چلے گا کہ علی بابا کی کامیابی صرف ایک ویب سائٹ کی وجہ سے ہرگز نہیں، بلکہ اس کے پس منظر میں ایک مضبوط اور محفوظ نظام موجود ہے، جو صارف کو محفوظ ادائیگی، مصنوعی ذہانت، جدید لاجسٹکس اور عالمی سپلائی کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ اس سے صارف اور ادارے کے درمیان ایک مستحکم رشتہ استوار ہو چکا ہے۔ اسی طرح ایمیزون صرف ایک کاروباری شناخت نہیں، بلکہ تیز رفتار سپلائی، بہترین ٹیکنالوجی اور اعلیٰ معیار کی کسٹمر سروس اس کی پہچان ہے۔ یہی نہیں، تیسرے بڑے ادارے دراز نے بھی ای کامرس کو عوامی سطح پر متعارف کرانے کے لیے اہم اور بڑا کردار ادا کیا، جس کی وجہ سے لاکھوں صارفین اور ہزاروں کاروبار دراز سے وابستہ ہیں۔

لیکن عالمی مارکیٹ میں مقابلہ صرف مقامی فروخت سے نہیں جیتا جا سکتا۔ اس لیے پاکستانی کاروبار کو بھی کوالٹی کنٹرول، عالمی معیار، پیکیجنگ، برانڈنگ اور بعد از فروخت سہولیات پر سرمایہ کاری کرنا ہوگی۔ جبکہ پاکستان میں صورتحال مختلف ہے۔ بڑی تعداد میں آن لائن آرڈرز کیش آن ڈلیوری کے ذریعے ہوتے ہیں۔ اس نظام میں جعلی آرڈرز، آرڈر منسوخی، ریٹرن ریٹ اور کیش فلو جیسے مسائل کاروباری رفتار میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اسی طرح چھوٹے کاروبار زیادہ فروخت کے باوجود منافع حاصل نہیں کر پاتے، کیونکہ ترقی یافتہ کاروبار کی بنیاد اعتماد سازی پر ہوتی ہے، جبکہ ہمارے ہاں ناقص ڈلیوری سسٹم، عدمِ کوالٹی کنٹرول اور بعد از فروخت کسی قسم کی سہولت موجود نہیں ہوتی۔

اگر ای کامرس نظام کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی کہ حقیقی مسئلہ ٹیکنالوجی کا نہیں، صرف سوچ کا ہے۔ جب تک سوچ مثبت نہیں ہوگی، بہتر نتائج نہیں نکل سکتے۔ پاکستان میں اس وقت بھی ہزاروں کاروبار صرف سوشل میڈیا پوسٹس کو ہی ای کامرس سمجھتے ہیں،

جبکہ ایسا ہرگز نہیں۔ عالمی ادارے مصنوعی ذہانت کے ذریعے صارفین کی پسند اور ناپسند کا تجزیہ کر کے ڈیٹا کی بنیاد پر ہر فیصلہ کرتے ہیں، بلکہ خودکار گودام بھی استعمال کرتے ہیں۔

ہمارے نوجوان مختلف شعبہ جات میں اپنی صلاحیتوں اور ہنرمندی سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ٹیکسٹائل، کھیلوں کا سامان، چمڑے کی مصنوعات، طبی آلات اور دستکاری میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں جدید دور کے مطابق ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کی مدد سے دنیا بھر میں مؤثر انداز میں متعارف کرایا جائے۔ اس ضرورت کو کاروباری حضرات کے علاوہ حکومت بھی محسوس کر رہی ہے۔ اسی لیے حکومتِ پاکستان اور علی بابا گروپ کے درمیان ایک مفاہمتی یادداشت پر دستخط کیے گئے ہیں، جس کے تحت 10 ہزار پاکستانی ایس ایم ایز کو ڈیجیٹل تجارت اور مصنوعی ذہانت کی تربیت دی جائے گی، جبکہ کم از کم 2 ہزار کاروباروں کو عالمی منڈی تک رسائی کے مواقع فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس سلسلے میں پاکستان انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کا دعویٰ ہے کہ حکومت ڈیجیٹل انقلاب کے لیے سنجیدہ کوشش کر رہی ہے اور اس کے ثمرات بھی جلد قوم کو نظر آئیں گے۔ یقیناً پاکستان میں حالات کا مقابلہ کرنے اور عالمی چیلنجز سے نمٹنے کے لیے باصلاحیت اور پرعزم لوگوں کی

کمی نہیں۔ پاکستان کسی بھی شعبے میں کسی سے کم نہیں، ضرورت صرف باصلاحیت لوگوں کی حوصلہ افزائی اور انہیں ترقی کے مواقع فراہم کرنے کی ہے۔

اگر علی بابا کی طرح حکومت ایمیزون اور دراز جیسے اداروں سے نوجوانوں کی تربیت کی راہ ہموار کردے تو صرف 10 ہزار نہیں، ہزاروں نوجوان ہر سال ڈیجیٹل انقلاب کا ہراول دستہ بن سکتے ہیں۔ کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ پاکستان عالمی معیار کی صلاحیتیں نہیں رکھتا، لیکن عالمی مقابلوں کے لیے صرف صلاحیت کافی نہیں ہوتی۔ اس لیے حکومتی پالیسیوں اور کاروباری سوچ میں مثبت تبدیلی لاکر ایک مضبوط اور مربوط نظام بھی بنانا ہوگا، جس کے ذریعے کوالٹی کنٹرول، مؤثر لاجسٹکس، محفوظ ادائیگی اور مضبوط ڈیجیٹل انفراسٹرکچر کے انتظامات بھی کیے جا سکیں۔

اگر حکومت اور کاروباری حلقے حالات کے تقاضے کے مطابق ایسا کچھ کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مستقبل میں جہاں علی بابا، ایمیزون اور دراز کا نام آئے، وہاں پاکستانی برانڈز کا نام بھی عالمی ای کامرس کے انقلابی ناموں کے ساتھ شامل نہ ہو۔ ہماری نئی نسل جدید ٹیکنالوجی کے تقاضوں کو خوب سمجھتی ہے، بس اسے تھوڑی سی سہولت اور درست سمت کی رہنمائی چاہیے۔ اس کمی کو ذمہ داری سے پورا کردیا جائے تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے۔ ”ای کامرس“ اور ڈیجیٹل کاروباری سرگرمیوں کے ذریعے نہ صرف مہنگائی کے دور میں بلکہ مستقبل کے چیلنجز کا بھی مقابلہ کیا جا سکے گا۔

کیونکہ اس سے بے روزگاری کے بحران پر بھی قابو پایا جا سکے گا اور سالانہ آمدن میں نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے، جس سے ترقی وخوشحالی کی نئی راہیں بھی مل جائیں گی۔ اس لیے یہ سوال کہ کیا پاکستان عالمی تجارتی میدان میں مقابلے کے لیے تیار ہے یا نہیں — یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

ہر جنگ اور مقابلے کے لیے تربیت کے ساتھ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ''مین پاور'' کی کمی نہیں، نہ ہی باصلاحیت افراد کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ نوجوان نسل کو بامقصد تعلیم اور ہنرمندی کے گُر سکھائے جائیں۔ حکومت ایسے حالاتِ کار پیدا کرے، ای کامرس اور جدید کاروباری منڈیوں کے مواقع تلاش کرے اور نوجوانوں کو تیار کرے۔ عوامی سطح پر اساتذہ بھی تعلیم کو بامقصد اور کارآمد بنانے کے لیے طلبہ اور والدین میں آگاہی پیدا کریں، کیونکہ انقلاب کسی بھی حوالے سے ہو اس کے لیے صف بندی کرنی پڑتی ہے۔

امید ہے کہ اربابِ اختیار ہی نہیں، کاروباری شخصیات بھی سوچ کو پروان چڑھانے کے لیے ایک دوسرے سے مشاورت کریں گی۔ اگر ایسا اشتراک قائم ہو جائے تو پاکستان آئندہ چند سالوں میں دنیا کے معاشی انقلاب کا ایک اہم رکن بن سکتا ہے۔ صرف سوچ اور انداز بدلنے کے ساتھ مصمم ارادے کی ضرورت ہے۔ ''ہمتِ مرداں، مددِ خدا''۔

تعلیم بدلے پاکستان بدلے

فضیلہ اسلم

(مصنفہ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی لسانیات میں ماسٹر کر چکی ہیں اور اسکے علاوہ DEMP کے مجلّے "پاک جمہوریت" سے بھی منسلک ہیں)

پاکستان کا تعلیمی شعبہ طویل عرصے سے ایک سنگین بحران کا شکار ہے، جہاں کروڑوں بچے بنیادی تعلیم کے حق سے محروم ہیں اور موجودہ نظام جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ اس پس منظر میں، حکومت کی جانب سے کی جانے والی نئی کوششیں اور ہنگامی اعلانات ایک ایسے موڑ کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں روایتی تعلیم کو جدید ٹیکنالوجی سے جوڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تاہم محض اعلانات اور وسائل کی فراہمی سے قطع نظر، اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ آیا یہ اقدامات ملک میں تعلیمی زوال کا حقیقی اور پائیدار حل فراہم کر سکتے ہیں یا نہیں اور یہی اس مضمون کا بنیادی موضوع ہے۔

اسلام آباد میں 12 اگست کو اپنے ایک اہم خطاب میں، وزیر اعظم شہباز شریف نے ملک کے تعلیمی منظر نامے کو مکمل طور پر بدلنے کے لیے ایک وسیع 150 ارب روپے کے یوتھ ڈویلپمنٹ پیکج کے ساتھ ملک گیر "ایجوکیشن ایمرجنسی" (تعلیمی ہنگامی صورتحال) کا باقاعدہ اعلان کیا۔ اس جامع منصوبے کے تحت 2 کروڑ 60 لاکھ اسکول نہ جانے والے بچوں کا داخلہ یقینی بنانے اور ملک کے نوجوانوں کو عالمی ڈیجیٹل معیشت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا ایک برتراج مقصد قائم کیا گیا ہے۔ اس اقدام کا بنیادی محور جدید ٹیکنالوجی ہے، جس کے تحت میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلباء کو 250,000 کروم بک لیپ ٹاپس کی تقسیم، 10 لاکھ اسمارٹ فونز کی فراہمی، اور ملک گیر سطح پر انفارمیشن ٹیکنالوجی اور آرٹیفیشل انٹیلی جنس (مصنوعی ذہانت) کے مفت تربیتی پروگرام شامل ہیں۔ ان تکنیکی کوششوں کو مستقل بنیاد فراہم کرنے کے لیے، وزیر اعظم نے "دانش یونیورسٹی" کے قیام کا بھی اعلان کیا جسے پاکستان کی اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی یونیورسٹی کے طور پر ڈیزائن

کیا گیا ہے جو بہترین اور مستحق طلباء کو صرف میرٹ کی بنیاد پر بالکل مفت اعلیٰ تعلیم فراہم کرے گی۔

اس پالیسی اقدام کی وسعت اور اہمیت کو واضح کرنے کے لیے، وفاقی قیادت نے اس بحران کی سنگینی اور ماضی میں کیے گئے کامیاب اقدامات دونوں کا حوالہ دیا۔ وفاقی وزیر برائے تعلیم و پیشہ ورانہ تربیت، ڈاکٹر خالد مقبول صدیقی نے اس بات پر زور دیا کہ پاکستان میں اسکول نہ جانے والے بچوں کی تعداد دنیا کے 150 ممالک کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ بڑے پیمانے پر اصلاحات نافذ کرنے کی حکومتی صلاحیت کا اعادہ کرتے ہوئے، وزیر اعظم نے بطور وزیر اعلیٰ پنجاب اپنے سابقہ دور کی کارکردگی کا ذکر کیا، جہاں ان کی انتظامیہ نے اینٹ کے بھٹوں پر کام کرنے والے 90,000 بچوں کو اسکولوں میں داخل کروایا اور 10,000 اسکولوں کا انتظام پنجاب دانش اتھارٹی کے سپرد کیا تاکہ محروم طبقے کے بچوں کو مفت معیاری تعلیم اور رہائش فراہم کی جا سکے۔ ملکی حدود سے باہر کا رخ کرتے ہوئے، یہ اقدام بین الاقوامی تربیتی شراکت داریوں کو مزید وسعت دیتا ہے، جیسے کہ گزشتہ سال زرعی ٹیکنالوجی میں تعلیم کے لیے 1,000 طلباء کو چین بھیجا گیا تھا، اور اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اس سال آئی ٹی اور اے آئی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے میٹرک اور انٹر کے پوزیشن ہولڈر طلباء کا انتخاب کر کے انہیں چین بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔

حکومت کے ان وسیع ترین دعووں کے باوجود، ایک تنقیدی جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ پاکستان کے تعلیمی بحران کی جڑیں کئی بنیادی اور ساخت کاری مسائل سے جڑی ہوئی ہیں۔ 2 کروڑ 60 لاکھ بچوں کو اسکولوں تک لانے کے لیے ان سماجی و اقتصادی وجوہات کا خاتمہ ضروری ہے جو بچوں کو تعلیم سے دور رکھتی ہیں، جن میں بنیادی طور پر شدید غربت، مسلسل بڑھتی ہوئی مہنگائی، اور چائلڈ لیبر (بچوں کی مزدوری) پر

خاندانوں کا انحصار شامل ہے جہاں گھرانے بچوں کو مالی معاونت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ، پہلے سے موجود سرکاری اسکولوں کا بنیادی ڈھانچہ انتہائی خستہ حال ہے، جہاں اکثر جدید تعلیمی سہولیات، صفائی ستھرائی، اور محفوظ عمارتوں کی شدید کمی ہے۔ اگرچہ لیپ ٹاپ کی تقسیم اور جدید یونیورسٹیوں کے منصوبے قابلِ تعریف ہیں، لیکن تجزیہ کاروں کا ماننا ہے کہ ایک باضابطہ اور مرحلہ وار روڈ میپ کے بغیر، ایسے بڑے سرکاری اعلانات عملی اصلاحات کے بجائے صرف سیاسی نعروں تک محدود رہنے کا خطرہ رکھتے ہیں۔ حقیقی اور پائیدار تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ ہائی ٹیک سرمایہ کاری کے ساتھ ساتھ عام سرکاری اسکولوں کی حالتِ زار کو بہتر بنایا جائے اور جدید ڈیجیٹل وسائل کا استعمال اس انداز سے ہو کہ وہ طلباء کی تنقیدی صلاحیتوں کو ابھاریں، نہ کہ انہیں ذہنی سستی کی طرف لے جائیں۔

مجموعی طور پر، یہ 150 ارب روپے کا یوتھ پیکج اور ایجوکیشن ایمرجنسی جدید دنیا کی ضروریات، خصوصاً آئی ٹی اور مصنوعی ذہانت کے دور سے ہم آہنگ ہونے کے حکومتی عزم کی عکاسی کرتی ہے۔ تاہم محض جدید گیجٹس بانٹنا یا نئے ادارے بنانا ان بنیادی وجوہات کا حل نہیں ہے جو کروڑوں بچوں کو اسکولوں سے دور رکھتی ہیں۔ جب تک ایک ٹھوس اور واضح روڈ میپ کے تحت غربت، چائلڈ لیبر، خستہ حال اسکولوں اور روایتی نظامِ تعلیم میں بنیادی اور ساخت کاری اصلاحات نہیں کی جاتیں، تب تک اتنے بڑے اعلانات عملی پیش رفت کے بجائے صرف ایک پرکشش سیاسی نعرہ ہی ثابت ہوں گے۔

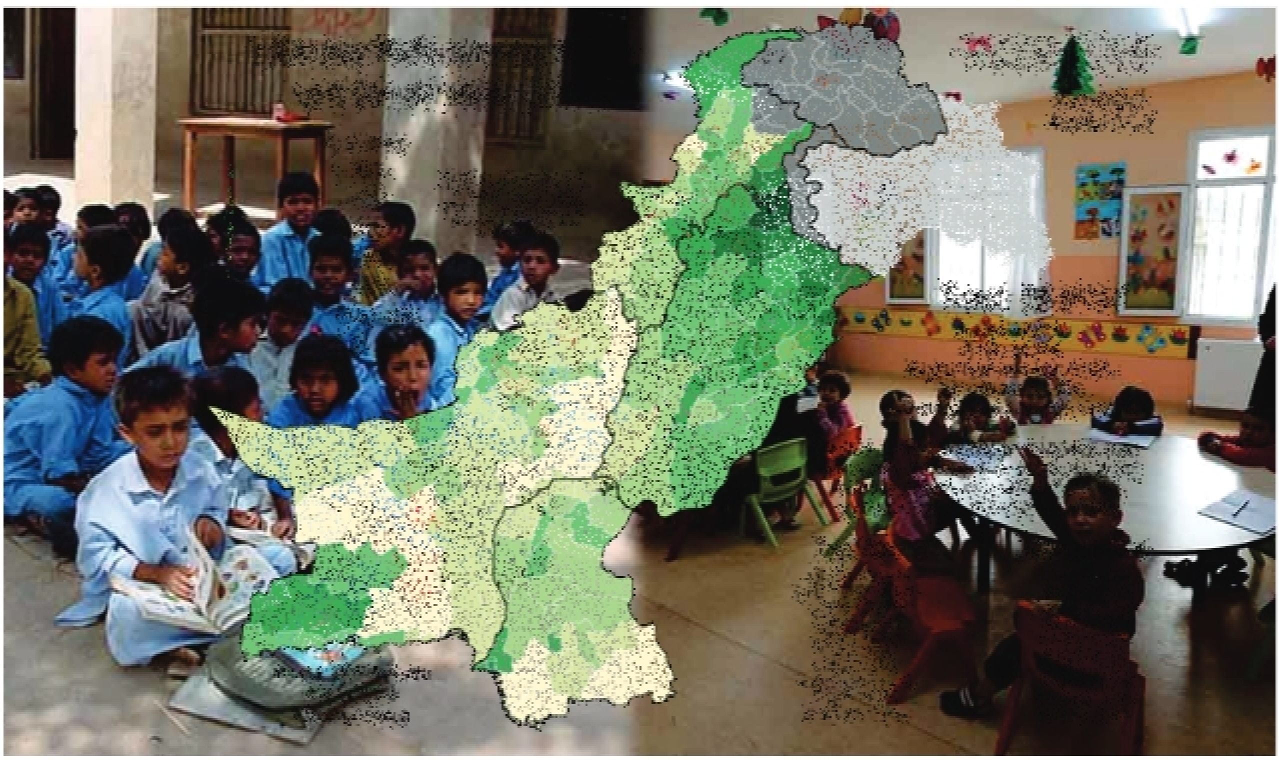

ہماری مطبوعات

نمبر شمار	مطبوعات	زبان	قیمت پاکستانی روپے	قیمت امریکی ڈالر
1	قائداعظم محمد علی جناح خطبات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (مجلد)	انگریزی	150/-	$-05
2	قائداعظم محمد علی جناح خطبات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (پیپر بیک)	انگریزی	150/-	$-05
3	قائداعظم محمد علی جناح خطبات اور بیانات بطور گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء (پیپر بیک)	اُردو	350/-	$-17
4	قائداعظم محمد علی جناح (تصویری البم) 1876ء تا 1948ء (مجلد)	انگریزی	350/-	$-17
5	قائداعظم محمد علی جناح (تصویری البم) 1876ء تا 1948ء (پیپر بیک)	انگریزی	350/-	$-17
6	قائداعظم کے مشہور اقوال	انگریزی	100/-	$-04
7	اقوال قائد (پیپر بیک)	انگریزی	50/-	$-03
8	قائداعظم کے بانی محمد علی جناح	انگریزی	400/-	$-15
9	جناح ایوان کا دور (از منیر بیگ)	انگریزی	250/-	$-10
10	مادرملت سرمایہ حیات	اُردو	250/-	$-10
11	مادرملت تصویری البم	اُردو	250/-	$-10
12	پاکستان وژنری کرافٹس	انگریزی	200/-	$-04
13	پاکستان کرونالوجی 1947ء تا 2006ء (چار جلدیں)	انگریزی	450/-	$-17
14	پاکستان کرونالوجی 1947ء تا 2006ء (پیپر بیک) (چار جلدیں)	انگریزی	400/-	$-15
15	پاکستان منظرنامہ	انگریزی	250/-	
16	پاکستان۔ بنیادی حقائق	انگریزی	50/-	$-02
17	آئیے پاکستان ایک طائرانہ نظر	انگریزی	2000/-	$-120
18	پاکستان۔ سرزمین (محمد امین۔ ڈنکن ولیٹس۔ گراہم ہینکاک)	انگریزی	1000/-	$-20
19	پاکستان آئینی مسودہ کی کتابیں (یونیک ایڈیشن)	انگریزی، عربی، فرانسیسی، چینی	500/-	$-20
20	اولین تصویر ایک جائزہ	انگریزی	2500/-	$-125
21	چولستان کے کنارے	انگریزی	60/-	
22	ہمارے ثقافتی رنگ	انگریزی	200/-	$-12
23	ٹرک آرٹ	انگریزی	200/-	$-08
24	گندھارا آرٹ ان پاکستان (از ڈاکٹر احمد حسن دانی)	انگریزی	100/-	$-04
25	مسلم آرٹ اینڈ ہیریٹیج آف پاکستان (از ڈاکٹر احمد حسن دانی)	انگریزی	100/-	$-04
26	اسلامی معاشرتی اقدار	اُردو	15/-	$-01
27	دست افکار (علامہ اقبال کی شاعری سے انتخاب)	اُردو	100/-	$-04
28	رحمت کا رشتہ (عبدالستار ایدھی)	انگریزی	615/-	$-50
29	ماہ نو غالب (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	500/-	$-60
30	ماہ نو اقبال (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	350/-	$-17
31	ماہ نو قائداعظم (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	500/-	$-60
32	ماہ نو فیض (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	500/-	$-60
33	ماہ نو احمد فراز (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	500/-	$-60
34	ماہ نو احمد ندیم قاسمی (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
35	ماہ نو جالب نمبر (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	500/-	$-60
36	ماہ نو جوش (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
37	ماہ نو انتخاب سلیم (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
38	ماہ نو انتخاب 2018ء (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
39	ماہ نو سرسید احمد خان (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-15
40	ماہ نو منیر نیازی (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	400/-	$-60
41	ماہ نو (ماہنامہ) (گذشتہ شمارے)	اُردو	100/- فی شمارہ	
42	ماہ نو (ماہنامہ) (آن لائن)	اُردو		
43	پاک جمہوریت (ارمغان حرم) (خصوصی ایڈیشن)	اُردو	10/-	
44	پاک جمہوریت (ماہنامہ) (گذشتہ شمارے)	اُردو	100/- فی شمارہ	
45	پاک جمہوریت (ماہنامہ) (آن لائن)	اُردو		
46	پاکستان کا ورثہ	انگریزی	200/-	$-120

رابطہ برائے خریداری

مینیجر: ڈائریکٹوریٹ جنرل آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلیکیشنز، بی۔ ایف بلڈنگ، زیرو پوائنٹ، اسلام آباد، پاکستان۔ فون: 051-9252182 فیکس: 051-9252176

DIRECTORATE OF ELECTRONIC MEDIA AND PUBLICATIONS

ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز، اسلام آباد
ریجنل آفس: 291 اے، ایم اے جوہر ٹاؤن لاہور۔